© rasailojaraid.com

ابوالکلام آزاد

اسلام اور سزاءِ قتل

المعارف کے گزشتہ شمارے (جنوری-مارچ ۲۰۰۶ء) کے اداریے: ''ناموسِ رسالت اور مقامِ نبوت کا تقاضا'' میں ہم نے لکھا تھا کہ اگر کوئی آدمی اپنی کسی تحریر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کوئی ایسی بات لکھتا ہے یا کوئی کارٹون بناتا ہے، جسے پڑھنے والا پیغمبر عالی مقام کی ذاتِ گرامی سے فروتر گردانتا ہے، ایسی تحریر، کارٹون یا خاکہ مسلمان شہریوں کی دل آزاری کا سبب بنتا ہے اور ملک میں بسنے والے باشندوں کے درمیان باہمی نزاع کھڑا کر دیتا ہے، تو ایسی تحریر کو کوئی بھی سلیم الطبع آدمی پسند نہیں کر سکتا۔ کیونکہ اس قسم کی پست حرکت سے سوسائٹی میں فتنہ وفساد کی آگ بھڑک اُٹھتی ہے۔ اس کی ایک مثال ڈنمارک سے شائع ہونے والے ایک پرچے کی وہ انتہائی غیر ذمہ دارانہ حرکت ہے، جس میں اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق کارٹون شائع کیے، جن سے پوری مسلم دُنیا کی دل آزاری ہوئی، اور جس کے نتیجے میں بعض مقامات پر پُرتشدد مظاہرے بھی ہوئے ہیں۔ ان افسوسناک واقعات کی ذمہ داری براہِ راست ڈنمارک کے جریدے پر عاید ہوتی ہے، جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بے ہودہ کارٹون شائع کیے ہیں۔ اسی قسم کی ایک انتہائی غیر ذمہ داری کا مظاہرہ ۱۹۲۷ء میں پنجاب میں بھی ہوا تھا، جب راج پال نامی ایک پبلشر نے ایک دل آزار کتاب ''رنگیلا رسول'' شائع کی تھی، جس کے خلاف برِعظیم اور خاص طور پر پنجاب میں سخت مظاہرے ہوئے اور ہندو مسلم تعلقات انتہائی کشیدہ ہو گئے، حتیٰ کہ راج پال کو قتل کر دیا گیا تھا۔ اس مہمل کتاب کے خلاف لاہور ہائی کورٹ کے ایک جج جسٹس کنور دلیپ سنگھ نے اپنے فیصلہ میں یہ تسلیم کیا تھا: ''یہ کتاب یقیناً بانیٔ (داعیٔ) اسلام کی ہجو پر مشتمل ہے [illegible] اور مسلمانوں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے احساسات مجروح ہونے کا احتمال ہے، بلکہ ان کے دلوں میں نفرت کے جذبات پیدا ہونے کا خیال بھی حق بجانب ہے۔'' بااین ہمہ جسٹس دلیپ سنگھ نے یہ بھی لکھا کہ ''اس قسم کا فعل دفعہ ۱۵۳ الف کی زد میں نہیں آتا جو پراسیکیوٹر کی طرف سے لگائی گئی ہے۔''

اس رسوائے زمانہ کتاب ''رنگیلا رسول'' کی اپیل پر لاہور ہائی کورٹ نے جو فیصلہ دیا، اس پر مولانا ابوالکلام آزاد نے لکھا تھا: ''بہرحال ہندوستان کی اعلیٰ عدالتوں میں سے ایک عدالت کا فیصلہ اس کے خلاف ہوگیا ہے اور اب اس کے سوا چارہ نہیں کہ ایک صاف اور غیر مشتبہ قانون کے ذریعے اس طرح کی مذہبی دلآزاری (یا نکتہ چینی) کا سدِ باب کیا جائے۔'' (الہلال ۱-۸، جولائی ۱۹۲۷ء، ص ۳)

جب اس بے ہودہ کتاب پر ایک طوفان بپا ہوا تو ایک سلیم الطبع ہندو نے مولانا ابوالکلام آزاد سے سوال کیا تھا کہ ایسی کتاب کے بارے میں شریعتِ اسلامیہ کیا کہتی ہے؟ اس سوال کے جواب میں مولانا آزاد نے الہلال میں (۹ر ستمبر ۱۹۲۷ء، ۷ر اکتوبر ۱۹۲۷ء، ۱۴ر اکتوبر ۱۹۲۷ء اور ۹ر دسمبر ۱۹۲۷ء) ''اسلام اور سزاءِ قتل'' کے نام سے مقالہ لکھا۔ جس میں مسئلہ زیرِ بحث کے تمام پہلوؤں کا انتہائی دقتِ نظر سے جائزہ لیا۔ اہلِ نظر جانتے ہیں کہ قدرت نے ابوالکلام آزاد کو تقریر وتحریر کی کن کن صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ حسرت موہانی نے سچ کہا تھا:

جب سے دیکھی بوالکلام کی نثر
نظمِ حسرت میں کچھ مزا نہ رہا

موجودہ وقت میں مسلم سوسائٹی میں ڈنمارک کے غیر ذمہ دار صحافی کے رویہ پر جو تنقید وتبصرہ ہو رہا ہے، ہم اس مسئلہ میں مولانا ابوالکلام کی اس تاریخی تحریر کو دوبارہ شائع کر رہے ہیں۔ تاکہ ہم اس کی روشنی میں ہنگامہ آرائی اور توڑ پھوڑ کی سیاست سے ہٹ کر دل آزار تحریروں کا سنجیدگی سے جائزہ لے سکیں۔

یہاں یہ بات بھی پیشِ نظر رہے کہ قرآن مجید نے مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ ''وہ ان موجودات (Beings) کو برا بھلا نہ کہیں جنہیں اہلِ شرک خدا کی بجائے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پکارتے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ اس کے جواب میں یہ لوگ (مشرک) اپنی جہالت سے اللہ کو سبّ و شتم کرنے لگیں۔" (الانعام:۱۰۸) اس بات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ قرآن مجید اہلِ ایمان کے طرزِ فکر، طرزِ عمل کو کس قدر پاکیزہ دیکھنا چاہتا ہے۔ اس لیے ہمارا اخلاقی فرض ہے کہ ان نادان لوگوں کے بارے میں جو رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف اخلاقی پستی کا مظاہرہ کرتے ہیں، انتہائی صبر و تحمل سے اس کا جواب دیں، مقصد اصلاح ہے، ہنگامہ آرائی نہیں۔

رشید احمد (جالندھری)

مندرجہ ذیل مراسلت پنجاب کے ایک ہندو دوست کی ہے جو وہاں کی ایک مذہبی انجمن کے عہدہ دار بھی ہیں۔ ۱۹۲۵ء میں اُنھوں نے مجھ سے خط و کتابت کی تھی اور اپنی طبیعت کی مذہبی بے اطمینانی اور جستجوئے حق و حقیقت کا شوق ظاہر کیا تھا۔ جب کبھی کوئی آدمی اس بارے میں مجھ سے مشورہ کرتا ہے، تو میں ہمیشہ اُسے تقلیدی بندشوں سے آزاد ہونے اور مذاہب کے آزادانہ مطالعہ کا مشورہ دیتا ہوں۔ یہی مشورہ میں نے اُنھیں بھی دیا۔ اِس پر اُنھوں نے بہت سے سوالات لکھ کر بھیجے جن میں سے بعض سوالات کا تعلق اُن شکوک سے تھا جو نفسِ مذہب اور اُس کی ضرورت سے تعلق رکھتے تھے، اور بعض کا تعلق مسیحیت اور اسلام سے تھا۔ چونکہ خط و کتابت کے ذریعہ اس طرح کے معاملات انجام نہیں پا سکتے، اس لیے میں نے اُنھیں لکھا کہ چند دِنوں کے لیے کلکتہ آ جائیں اور میرے پاس ٹھہریں۔ وہ آئے اور کچھ عرصہ تک یہاں مقیم رہے۔ میں نے محسوس کیا کہ بہت حد تک اُن کی طبیعت تقلیدی بندشوں سے آزاد ہو چکی ہے، اور آزادیٔ فکر کے ساتھ مسائل کے مطالعہ کی استعداد رکھتے ہیں۔ وہ جب واپس جانے لگے تو اُنھوں نے اعتراف کیا کہ اُن کی طبیعت کا دو تہائی اضطراب دُور ہو چکا ہے۔

اِس کے بعد وقتاً فوقتاً وہ مجھ سے خط و کتابت کرتے رہے۔ گذشتہ دسمبر میں گوہٹی کانگرس کے موقعہ پر پھر کلکتہ آئے اور مجھ سے ملے، اور میں نے اُن کی قلبی حالت سابق سے زیادہ ترقی یافتہ پائی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اِس ہفتہ اُن کی یہ تحریر میرے نام آئی ہے۔ ضرورت نہ تھی کہ اسے الہلال میں درج کیا جاتا۔ میں حسبِ معمول اس کا جواب اُنھیں بھیج دیتا، لیکن تحریر کے آخر میں اُنھوں نے جو کچھ لکھا ہے، اور اس سے اُن کی طبیعت کے جن تأثرات کا پتہ چلتا ہے، اُن کے ازالہ کے لیے ضروری ہو گیا کہ یہ خط الہلال میں درج کر دیا جائے، اور الہلال ہی کے ذریعہ جواب دیا جائے۔ اِس ہفتہ یہ شائع کر دیا جاتا ہے، لیکن جواب آئندہ ہفتہ لکھ سکوں گا، کیونکہ آج یکا یک شملہ جانے کا ارادہ کر لینا پڑا۔ اِس لیے تحریر کی مہلت نہیں ہے۔ [ابوالکلام آزاد]

''میں نے اِدھر مدت سے کوئی عریضہ آپ کی خدمت میں اس لیے نہیں بھیجا کہ میں ارادہ کر چکا تھا کہ راولپنڈی کے معاملات نپٹا کر کلکتہ میں حاضری دوں گا۔ لیکن گھر کے جھگڑے ایسے نکل آئے کہ اب تک چھٹکارا نہ ہو سکا اور شاید کچھ دِنوں اور اِسی طرح نکل جائیں۔ میں اب بھی یہ خط لکھ کر جناب کے اوقات میں خلل نہیں ڈالتا اور ساری باتیں اپنی حاضری پر اُٹھا رکھتا، لیکن اس طرف ایک معاملہ نے میرے خیالات میں نہایت پریشانی پیدا کر دی ہے اور میں اس کو زیادہ دیر تک روک نہیں سکتا۔ مجھ کو یقین ہے کہ وہ معاملہ میرے ہی لیے نہیں بلکہ مجھ سے زیادہ ہزاروں انسانوں کے لیے بے دلی اور پریشانی کا سبب بن رہا ہوگا، اِس لیے مجبوراً یہ عریضہ لکھ کر جناب کا تھوڑا سا وقت ضائع کرنا چاہتا ہوں۔ ضرورت تو اس بات کی تھی کہ آپ اس عریضہ کا جواب، یا اسے چھوڑ کر بطور خود اِس معاملہ میں اپنی رائے اخبارات کے صفحوں پر شائع کر دیتے یا الہلال ہی میں ارقام فرماتے لیکن اگر پبلک میں اس کی اشاعت خلافِ مصلحت ہو تو کم سے کم میرے دِل کا اضطراب تو دُور کر دیں۔

جناب پر ایک مدت سے میرے دل کا حال پوری طرح روشن ہے۔ میں ہر طرح کے مذہبی اور کمیونل تعصّبات سے الگ ہو کر مذاہبِ عالم میں سچائی اور حقیقت کا متلاشی ہوں، اور مجھے آپ کی ذات مبارک سے اِس بارے میں وقتاً فوقتاً جو مدد ملی ہے، اس کے لیے مدۃ العمر میں آپ کا احسان مند رہوں گا۔ آپ نے میری آنکھوں پر سے کج فہمی کے بہت سے پردے ہٹا دیئے، اور میرے دِل کو جو پیروانِ مذاہب کی حالت دیکھ کر مذہب کی طرف ہی سے برگشتہ ہو گیا تھا، پھر مذہب کی صداقتوں کی راہ پر لگا دیا۔ خصوصاً مذہب اسلام اور اُس کے بانی کی تعلیم کی جو حقیقت آپ نے مجھ پر روشن کر دی وہ ایسی ہے کہ میرے خیال میں کوئی انسان بھی جو انصاف اور حق پرستی سے بالکل محروم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نہ ہو گیا ہو اُس کی طرف بے اختیار کھنچے ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کم سے کم وہ اُس کی عزت اور احترام کرنے سے تو کبھی انکار نہیں کرے گا۔

آپ کو معلوم ہے کہ میں دو برس سے بالکل ایک دوسری ہی نگاہ سے مذہبی صداقت کا مطالعہ کر رہا ہوں، لیکن مجھے معاف کیجیے گا۔ ایک بہت بڑی مشکل ہم لوگوں کی راہ میں یہ ہے کہ آپ جیسے بزرگ اسلام کی تعلیم اور اسپرٹ جو ظاہر کرتے ہیں، وہ جب دوسرے مسلمانوں کی تعلیم میں ڈھونڈی جاتی ہے تو صرف یہی نہیں کہ نہیں ملتی بلکہ برخلاف اس کے ایسی ایسی باتیں سامنے آ جاتی ہیں کہ کوئی انصاف پسند دماغ شک وشبہ کے طوفان سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ ابھی حال میں پمفلٹ ''رنگیلا رسول'' پر جو ایجی ٹیشن شروع کیا گیا اور جو جو باتیں بڑے بڑے مسلمان لیڈروں اور مولانا صاحبان نے جلسوں اور اخباروں میں ظاہر فرمائیں، میری بے ادبی معاف فرمائی جائے اگر میں عرض کروں کہ اسے دیکھ کر میرا جیسا غیر جانبدار آدمی بھی اِسلام کے متعلق اپنے خیالات پر قائم نہیں رَہ سکا۔ اور جن لوگوں کے دِل و دماغ پہلے ہی سے شک اور شبہات سے بھرے ہوئے ہوں گے اور ہزاروں لاکھوں غیر مسلم ایسے ہی ہیں، اُن کے خیالات جیسے کچھ ہو گئے ہوں گے، اُس کا آپ اندازہ فرما لیجیے۔ اگر فی الحقیقت اِسلام کی تعلیم اَپنے ماننے والوں کے لیے ایسی ہی ہے اور اس کے احکام کا یہی حال ہے تو پھر وہ تعلیمات شبہ سے خالی نہیں ہیں جو آپ نے میرے دِل پر نقش کی ہیں، اور اگر حقیقتِ حال ایسی نہیں ہے، تو یہ باور کرنا بہت مشکل ہے کہ ہزاروں لاکھوں آدمی ایک ہی طرح کی بے بنیاد بات پر اکٹھے ہو جائیں اور اس زور شور سے اس کا اعلان کریں اور اس کا رَدّ نہ کیا جائے۔

اس بیہودہ پمفلٹ ''رنگیلا رسول'' پر مدت سے کیس چل رہا تھا۔ جب یہ چھاپا گیا تھا تو میں نے بھی دیکھا تھا، اور میں سچ عرض کرتا ہوں کہ اسے پڑھ کر میرے دل پر اس کے سوا کوئی اثر نہیں پڑا کہ اُس کا لکھنے والا سخت حقیر و ذلیل ہو گیا۔ دُنیا میں کوئی شریف اور شائستہ انسان خواہ کسی مذہب اور اعتقاد کا ہو لیکن کبھی یہ بات پسند نہیں کرے گا کہ دُنیا کے اُن بانیانِ مذاہب کا جن کی تعلیمات نے لاکھوں کروڑوں انسانوں کو خدا پرستی کی راہ پر لگایا ہے، گندے لفظوں میں ذکر کیا جائے، یا اُن کی زندگی کی نامعقول طریق پر ہنسی اُڑائی جائے۔ البتہ ایسے نادان اور جاہل آدمی اِس دُنیا میں ہمیشہ رہے ہیں اور ہمیشہ رہیں گے۔ جب مسلمان اخبارات نے اس کے خلاف پروٹسٹ کیا، تو میں نے انہیں بالکل حق بجانب سمجھا۔ مجھے میرے بعض دوستوں نے بتلایا کہ اگرچہ یہ پمفلٹ ہر حال میں قابلِ اعتراض ہے لیکن یہ خود مسلمانوں کے ایک ایسے ہی گندے پمفلٹ کے جواب میں لکھا گیا ہے۔ لیکن میں نے کہا اگر کسی مسلمان نے لکھا تھا تو ایک بُرائی کی تھی، اور کسی انسان کے بُرائی کرنے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی وجہ سے دوسرے انسانوں کے لیے بری بات اچھی نہیں ہو جاسکتی۔

یہاں تک تو یہ بات ٹھیک تھی، لیکن پھر اس کے بعد جو طریقہ ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک تمام مسلمانوں نے اختیار کیا اور ایک کے بعد ایک جو باتیں کہی گئیں، وہ نہ صرف حق و انصاف کے خلاف تھیں بلکہ کچھ عجیب طرح کی مذہبی مینٹلٹی ظاہر کرتی تھیں جنھیں کسی طرح بھی کسی ٹھیک راستے پر لے جایا نہیں جاسکتا۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ تمام لیڈروں اور مولانا صاحبان نے اور جمعیت العلما نے جس میں پانچ سو مولوی صاحبان کا ہونا بتلایا گیا ہے، فتویٰ جاری کر دیا کہ ''رنگیلا رسول'' لکھنے والے اور چھاپنے والے کو قتل کرنا چاہیے۔ اور یہ کہ شریعت اسلام کا قانون یہی ہے کہ جونہی کوئی غیر مسلمان حضرت بانیٔ اسلام کے خلاف کوئی بدزبانی کرے، اسے فوراً مار ڈالنا چاہیے۔ مجھے معاف رکھا جائے اگر میں عرض کروں کہ اس بات کے کہنے میں تو کوئی بڑائی کی بات نہیں ہے کہ جب کبھی ہماری بن آئی تھی تو ہم اپنے خلاف ہرزباں دراز آدمی کو مار ڈالتے تھے۔ اگر اسلام کو اس پر فخر ہے تو یہ ایسا فخر نہیں ہے جو صرف اُسی کے حصے میں آیا ہو۔ جس کسی کو دُنیا میں طاقت ملی ہو اُس نے لوگوں کو قتل کیا ہے اور تلوار کے زور سے اپنی ہیبت قائم کی ہے۔ اسلام کا فخر تو اس بات میں ہونا چاہیے تھا کہ اُس نے انسانوں کو سزا دینے کی جگہ بخشا ہے، اور قتل کرنے کی جگہ زندگی بخشی ہے۔ جناب نے مجھے پچھلے سال لکھا تھا کہ اسلام کی اصلی اسپرٹ انسانیت کی اسپرٹ ہے اور یہی فرق اُس میں اور تمام مذاہب میں ہے۔ اُس نے ہر گوشہ کو انسانیت کی نظر سے دیکھا ہے۔ ملک، جماعت اور وطن کی نگاہ سے نہیں دیکھا ہے۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسی حالت میں کیونکر اسلام کا یہ قانون انسانیت کی اسپرٹ کے ساتھ ہوسکتا ہے کہ جہاں کوئی نادان اور جاہل آدمی بانیٔ اسلام کے خلاف بدزبانی کرے فوراً اس کے دو ٹکڑے کر دیے جائیں۔

آپ یقین فرمایئے کہ یہ بات میری اس عقیدت کی جو میں اسلام سے رکھتا ہوں اتنی خلاف تھی کہ پہلے تو مجھے اس پر یقین نہیں ہوا، لیکن اس کے بعد میں نے جب خود جمعیت العلما اور انجمن خدامِ دین اور مولانا محمد علی صاحب کے فتوے اپنی آنکھوں سے دیکھے تو اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا کہ اسے تسلیم کر لیتا۔

اچھا اگر یہ اسلام کا قانون بھی ہو جب بھی ہندوستان میں اسے رائج کرنے کا مطالبہ کرنا میں نہیں سمجھتا کیا معنی رکھتا ہے۔ اگر بانی اسلام کے لیے مسلمان ایسا قانون چاہیں گے تو دوسرے مذاہب بھی مطالبہ کریں گے۔ پھر کیا مسلمان اس سے متفق ہوں گے کہ جو مسلمان ہندوؤں، پارسیوں، بدھسٹوں کے بزرگوں کے خلاف بدزبانی کرے، اسے فوراً قتل کر ڈالنا چاہیے؟

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جس قدر واقفیت مجھے اسلام کی کتابوں سے ہے، اس کے مطابق میں نے اس قانون کی تحقیق کرنی چاہی۔ مجھے اس کا کوئی پتہ نہیں چلا۔ لیکن رسالہ ورتمان کیس میں جن مولوی صاحبان نے شہادت دی ہے، انھوں نے بتلایا ہے کہ کتاب سارم مسلول (الصارم المسلول) میں ایسا ہی لکھا ہے۔ میں نے یہاں اپنے مسلمان دوستوں سے اس کتاب کے بارے میں پوچھا تو وہ کچھ نہیں بتلا سکے۔ بہرحال جمعیت العلما کے فتوے اور مولنا محمد علی صاحب کے اعلان سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کا حکم ایسا ہی ہے۔

علاوہ بریں اس معاملہ میں یہ طریقِ عمل بھی اسلام کے اخلاق کا کوئی اچھا اثر ہم لوگوں پر نہیں ڈال سکتا کہ جس شخص نے اسلام کے خلاف کچھ لکھا ہو، اُسے بازاری گالیاں دی جائیں اور ملعون، کتا اور ایسے ہی لفظ کہے جائیں جیسے مولنا محمد علی صاحب جیسے ذمہ دار لیڈر برابر اپنی تقریروں میں کہتے رہے۔ کیا اُس شخص کو گالی دینے سے اُس کی اس بدزبانی اور بے ادبی کا بدلہ لے لیا جا سکتا ہے جو اُس نے بانی اسلام جیسے عظیم الشان انسان کی شان میں کی ہے؟ اگر نہیں تو اس طرح کی گالیاں دینے سے خود اپنا اخلاق خراب ہوتا ہے اور کوئی نتیجہ نہیں نکل سکتا۔

یہ بات بھی میری سمجھ میں نہیں آتی کہ محض ایک دو نادان اور بدزبان آدمیوں کے کچھ لکھ دینے پر اس قدر جوش وخروش دکھلایا جائے، گویا مسلمانوں کے لیے کوئی بڑی مصیبت کی بات پیش آ گئی ہے، حالانکہ خود مسلمان صاحبان تمام غیر مذاہب کے خلاف برابر ہر قسم کی اچھی بری باتیں کہتے آئے ہیں اور ان کی وجہ سے کبھی نہ تو ہندوؤں نے اس طرح شور مچایا ہے نہ عیسائیوں نے۔ یقیناً اس طرح کی باتوں سے جو مینٹیلیٹی ثابت ہوتی ہے وہ قابلِ تحسین نہیں ہے۔

یہ بھی آپ کو معلوم ہے کہ ہندوؤں میں آریہ سماج کے قائم ہونے سے پہلے نہ تو کسی طرح کا تبلیغ کا خیال تھا اور نہ وہ مذہبی بحث مباحثہ کرتے تھے۔ لیکن مسلمانوں کی جانب سے ہمیشہ کتابیں اُن کے خلاف لکھی جاتی تھیں۔ میں نے لاہور میں پانچ کتابیں ایسی دیکھی جو اس ایجی ٹیشن کی وجہ سے چند صاحبوں نے جمع کی ہیں، اور میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ ان میں ہندوؤں کے رشیوں اور اُوتاروں کے خلاف جو بے ہودہ باتیں لکھی ہیں وہ اس بیہودگی سے بہت زیادہ ہے جو ''رنگیلا رسول'' لکھنے والے نے دکھلائی ہے۔ یہ کتابیں بیس بیس تیس تیس برس سے ہزاروں کی تعداد میں چھپ کر فروخت ہوتی ہیں، لیکن کبھی اُنھوں نے یہ مطالبہ نہیں کیا کہ ان کے لکھنے والوں کے سر قلم کر دیے جائیں۔ معلوم نہیں جنابِ والا کی نظر سے یہ کتابیں گزری ہیں یا نہیں۔ اگر ارشاد ہوگا تو میں بھجوا دوں گا۔ ایک کتاب تحفۃ الہند ہے جو مولوی عبداللہ صاحب [illegible] کی لکھی ہے جو دہلی کے بڑے مولوی ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس میں ایک نظم ہے جس کا ٹیپ یہ ہے: ''کہو یہ کون دھرم ہے؟''

اس میں ہندوؤں کے رشیوں، اوتاروں کے خلاف اس قدر فحش اور گندے طریقہ سے اظہارِ خیال کیا ہے کہ کوئی مہذب آدمی اُسے پڑھ بھی نہیں سکتا۔ میری ناقص عقل اس بات سے عاجز ہے کہ جب خود مسلمانوں کا یہ طرزِ عمل دوسروں کے ساتھ ہے تو وہ خود اس قدر حد سے زیادہ شور وغل کیسے مچا سکتے ہیں؟

علاوہ بریں یہ بات بھی بڑی عجیب ہے کہ اسلام کے قانون میں اپنے مخالفوں کے لیے معافی کی کوئی جگہ نہیں۔ ''رنگیلا رسول'' کے پبلشر نے صاف لفظوں میں اظہارِ افسوس کر دیا تھا، لیکن مسلمانوں کا یہ مطالبہ تھا کہ نہیں اسے قتل کرنا چاہیے!

مجھے میرے دوستوں نے کہا ہے کہ اس وقت ملک کی جو عام حالت ہو رہی ہے اور مسلمانوں کے اندھا دھند جوش وخروش کا جو حال ہو رہا ہے اسے دیکھتے ہوئے یہ مصلحت کے خلاف ہوگا کہ جناب کوئی بات بھی اپنے ہم مذہبوں کی عام رائے کے خلاف کہیں۔ اس لیے یہ سب کچھ آپ دیکھتے ہیں لیکن خاموش ہیں۔ اگر میرے دوستوں کا یہ خیال صحیح ہو تو اگرچہ یہ بات میرے لیے بڑے ہی رنج کی ہوگی لیکن میں ایسی گستاخی نہیں کر سکتا کہ اس بارے میں زبان کھولوں۔ کم از کم یہی کیجیے کہ اس بارے میں میرے دل کے شکوک دُور کر دیجیے کیونکہ ان کی وجہ سے مجھے بہت ہی پریشانی ہو رہی ہے۔ میں چاہتا ہوں صاف صاف معلوم ہو جائے کہ اسلام کے احکام اور تعلیمات کیا ہیں۔

اگر جناب ترتیب کے ساتھ جواب عنایت کریں گے تو زیادہ بہتر ہوگا۔ میں نمبروار عرض کر دیتا ہوں:

(۱) کیا واقعی یہ اسلام کا قانون ہے کہ جو شخص حضرت بانی اسلام کے خلاف بدزبانی کرے، اسے فوراً قتل کر دینا چاہیے اور جس مسلمان کے سامنے ایسا کرے، اُس کا مذہبی فرض ہے کہ اُسی وقت اُس کا سر اُڑا دے؟

(۲) کیا اسلام کا یہ حکم ہے کہ اگر کسی قوم کا ایک آدمی حضرت پیغمبر الاسلام کے خلاف بدزبانی کرے تو جب تک اس کے تمام ہم قوم (جنھوں نے شاید اُس بدزبانی کرنے والے کا نام بھی نہ سُنا ہوگا) اس کو برا بھلا نہ کہیں۔ تمام قوم کا بائیکاٹ کر دینا چاہیے اور اپنی بستی سے نکال دینا چاہیے۔

(۳) کیا اسلام کا یہ قانون ہے کہ اگر کوئی غیر مسلمان ایسا کرے تو اسے گلا گھونٹ کر مار ڈالنا چاہیے جیسا کہ مولانا محمد علی صاحب نے فرمایا ہے؟

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(۴) آپ کے خیال میں یہ مطالبہ ٹھیک ہے کہ ہندوستان میں ایسا قانون بنانا چاہیے کہ جو شخص ایسا کرے اسے قتل کر ڈالا جائے؟

(۵) کیا اسلام کا یہ قانون ہے کہ اگر ایسا شخص اپنی غلطی مان لے اور اس پر افسوس ظاہر کرے، تو وہ مسلمانوں کو قبول نہیں کرنا چاہیے اور اسے جسمانی سزا دلانے پر اڑ جانا چاہیے؟

(۶) جو کتابیں دیگر مذاہب کے خلاف خود مسلمان مولوی صاحبان لکھتے آئے ہیں اور اس میں ''رنگیلا رسول'' جیسی زبان استعمال کی گئی ہے، کیا وہ بھی اسی طرح سزا کی مستحق نہیں ہیں، جیسی ''رنگیلا رسول'' اور رسالہ درتمان ہیں؟

(۷) سو دو سو برس سے جو سیکڑوں عیسائی مشنری اسلام کے خلاف سخت سے سخت کتابیں لکھتے آئے ہیں اور اس وقت ہزاروں کی تعداد میں وہ موجود ہیں، کیوں ان کے خلاف اس قدر جوش و خروش نہیں دکھلایا گیا جس قدر اس موقع پر دکھلایا گیا ہے؟

کیا میں اُمید کروں کہ آپ تھوڑا سا وقت نکال کر اُسی انداز میں جیسا تفصیل و بحث کے ساتھ ہمیشہ آپ نے لکھا ہے، ان امور پر روشنی ڈالیں گے اور مجھ پر احسان فرمائیں گے۔

(۲)

الہلال نمبر ۱۳ میں، ایک عزیز طالبِ حق کی جو مراسلت درج کی گئی تھی، افسوس ہے کہ پے در پے سفر اور علالتِ طبع کی وجہ سے اُس کی طرف متوجہ ہونے کی مہلت نہیں ملی۔ اَب اُس کے لیے وقت نکال سکا ہوں۔

مذہب اور پیروانِ مذہب:

میرا خطاب عزیز موصوف سے ہے۔

افسوس ہے، اس خط میں آپ نے اپنے جو تأثرات ظاہر کیے ہیں، وہ اُسی اصولی غلطی کا نتیجہ ہیں جس سے پرہیز کرنے کا آپ نے ارادہ کیا تھا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ جب آپ پہلے پہل مجھ سے ملے، اور اپنے دل کے شکوک و اضطراب مجھ پر ظاہر کیے، تو میں نے بعض مقدمات آپ کے ذہن نشین کرنے چاہے تھے۔ میں نے کہا تھا کہ یہ وہ بنیادی مقدمات ہیں جن کے بغیر آج طلبِ حقیقت کی راہ میں ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھایا جا سکتا۔ من جملہ اُن

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مقدمات کے ایک مقدمہ یہ تھا کہ مذہب اور پیروانِ مذہب کا امتیاز ہمیشہ پیشِ نظر رہنا چاہیے۔ یہ دو مختلف چیزیں ہیں، ایک چیز نہیں ہے۔ مذہب کے بارے میں ہماری دو تہائی مایوسیاں صرف اسی غلطی کا نتیجہ ہوتی ہیں کہ ہم بسا اوقات ان دونوں کا عددی اختلاف بھول جاتے ہیں۔ میں سب سے پہلی بات جو آپ کے علم میں لانی چاہتا ہوں، یہ ہے کہ آپ نے جستجوئے حقیقت میں ایک بنیادی صداقت معلوم کی تھی اور اب اُس کا سررشتہ آپ کے ہاتھ سے چھوٹا جا رہا ہے اور افسوس ہے کہ آپ متنبہ نہیں ہیں۔

آپ لکھتے ہیں: ''ایک بہت بڑی مشکل ہم لوگوں کی راہ میں یہ ہے کہ آپ جیسے بزرگ اسلام کی تعلیم اور اسپرٹ جو کچھ ظاہر کرتے ہیں، وہ جب دوسرے مسلمانوں کی تعلیم میں ڈھونڈی جاتی ہے تو صرف یہ کہ نہیں ملتی بلکہ ایسی ایسی باتیں سامنے آتی ہیں کہ کوئی انصاف پسند دماغ شک وشبہ کے طوفان سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔'' سوال یہ ہے کہ اسلام کی جو تعلیم آپ کے علم میں آئی ہے، اگر فی الحقیقت آپ مطمئن ہو گئے ہیں کہ وہ اسلام کی تعلیم ہے، تو پھر آپ ''دوسرے مسلمانوں'' کی تعلیم میں اُسے ڈھونڈھنا کیوں چاہتے ہیں؟ آپ کو ''اسلام'' کی تعلیم کی تلاش ہے یا ''مسلمانوں'' کی تعلیم کی؟ یقیناً یہ دونوں چیزیں ایک نہیں ہوسکتیں۔ ایک چیز تعلیم بہ حیثیت تعلیم کے ہے اور ایک چیز اُس کے پیروؤں کا فہم وعمل ہے۔

اگر آپ کو اسلام کی تعلیم کی جستجو ہے، تو وہ دُنیا کی ہر تعلیمی حقیقت کی طرح صرف اپنے حقیقی سرچشمہ ہی میں ڈھونڈی جا سکتی ہے، نہ کہ انسانوں کی تعلیم میں اگرچہ وہ انسان اپنے اعتقاد میں مسلمان ہی کیوں نہ ہوں۔ اگر آپ کی اُس سرچشمہ تک رسائی ہوگئی ہے اور کم ازکم میرا تاثر آپ کی نسبت یہ تھا کہ آپ کو اس کا اعتراف ہے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ آپ اسلام کی تعلیم معلوم کرنے کے لیے خود اسلام تک پہنچ گئے ہیں، اور اس صورت میں آپ کے لیے صرف یہی رہ جاتا ہے کہ خود اسلام سے اسلام معلوم کریں، اور جب معلوم ہو جائے تو جہاں تک اسلامی تعلیم کا تعلق ہے، آپ کی جستجو ختم ہو جائے۔ بلاشبہ آپ کے لیے یہ بات باقی رہ جاتی ہے کہ مسلمانوں کی موجودہ زندگی میں اُس کا عمل تلاش کریں۔ لیکن ''عمل'' تلاش کریں۔ یہ نہیں کہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مسلمانوں کے ''عمل'' کو ''اسلام'' کی تعلیم قرار دے دیں۔ اگر مسلمانوں کی زندگی میں آپ کو اُس کا عمل نظر آئے تو آپ کو یہ رائے قائم کرنی چاہیے کہ اسلام کی تعلیم پر دُنیا کی مسلمان نامی جماعت عمل کر رہی ہے۔ نہ نظر آئے تو افسوس کرنا چاہیے، اور سمجھ لینا چاہیے کہ دُنیا کی عالمگیر گمراہیوں میں سے ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ مسلمان نامی جماعت بھی اسلام کی تعلیمات پر عامل نہیں۔ میں نہیں سمجھتا یہ قدرتی اور سچا طریقہ چھوڑ کر آپ نے غلط رَوی اور کج اندیشی کی راہ کیوں اختیار کی؟ جہاں آپ کو ''عمل'' دیکھنا چاہیے، وہاں آپ ''تعلیم'' ڈھونڈتے ہیں اور جہاں سے ''تعلیم'' کی حقیقت کا سراغ مل سکتا ہے، اسے اپنے پیچھے چھوڑ دیتے ہیں۔

عزیزِ من! میری وہ بات یاد کیجیے جو میں نے بار بار آپ کے ذہن نشین کرنی چاہی تھی: دُنیا کی کوئی تعلیمی صداقت بھی ایسی نہیں ہے جس کے پیرووں کا فہم و عمل حجت قرار دے کر ہم حقیقت کی طرف قدم بڑھا سکتے ہوں۔ مذہب کو چھوڑیے۔ دُنیوی اور مادی علوم و صنائع کا کوئی محدود سے محدود گوشہ لے لیجیے۔ کیا اس طریقہ سے ہم ان گوشوں میں بھی حقیقت کی طرف قدم اُٹھا سکتے ہیں؟ جب دُنیا کے ایک معمولی مصنف یا عالم کی کتاب کے لیے لاکھوں کروڑوں انسانوں کا فہم وادّعا کچھ مفید نہیں ہوسکتا، اگر کوئی ایسی بات بیان کی جائے جو خود اُس کتاب میں موجود نہ ہو، تو مذاہبِ عالم کے لیے جن پر انسانی فہم واستعداد کے تغیرات وحوادث کی صدیاں گزر چکی ہیں اور لاکھوں کروڑوں افراد کے احوال وظروف سے نسلاً بعد نسل اُن کے تعلیمی حقائق متاثر ہو چکے ہیں کیوں کر کسی فرد یا جماعت کا فہم و عمل حجت ہوسکتا ہے؟

طریقِ جدل اور طریقِ ہدایت:

معلوم نہیں آپ کو وہ بات بھی یاد رہی یا نہیں جو میں نے گذشتہ سال آپ کے ذہن نشین کرنی چاہی تھی۔ اس راہ میں بحث وجستجو کے ہمیشہ سے دو طریقے رہے ہیں۔ ایک طریقہ وہ ہے جسے قرآن نے اپنی زبان میں ''جدل'' کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ دوسرا طریقہ وہ ہے جسے ''ہدایت'' کے لفظ سے پکارا ہے۔ ''جدل'' کے معنی لڑنے جھگڑنے کے، ''ہدایت'' کے معنی سیدھی اور سچی راہ اختیار کرنے کے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وہ تمام لوگ جو حقیقت و صداقت کے متلاشی نہیں ہوتے بلکہ کسی خاص خیال اور جذبہ سے اپنی کوئی بات منوانی اور دوسرے کی کوئی بات گرا دینی چاہتے ہیں، طریقِ جدل پر عامل ہوتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے آپ کو کتنا ہی حق کا طالب و مطیع ظاہر کریں، لیکن فی الحقیقت وہ حق کے نہیں، اپنی ہواءِ نفس کے مطیع ہوتے ہیں۔ وہ سچائی کے متلاشی نہیں ہوتے کہ ہر موقع پر اُس کے ظہور و علم کے منتظر رہیں۔ وہ محض اپنے کسی ٹھہرائے ہوئے خیال اور اعتقاد کے پُجاری ہوتے ہیں، اور اس لیے ہمیشہ اس ڈھونڈ میں لگے رہتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح اپنی بات منوا دیں۔ مذاہبِ عالم کے پُرجوش حامیوں، مذہبی مجالس کے زباں دراز مناظروں، اور مذہبی بحث ونظر کے بنائے ہوئے نام نہاد علوم میں دسترس رکھنے والوں کا غالب حصہ اسی طریقِ جدل کی پیداوار ہے۔

لیکن دوسرا طریقہ طریق ''ہدایت'' ہے۔ یہ اُن لوگوں کی راہ ہے جو سچ مچ کو سچائی اور حقیقت کے متلاشی ہوتے ہیں، اور منوانے کے لیے بلکہ مان لینے کے لیے قدم بڑھاتے ہیں۔ وہ نہ تو کوئی خاص فریقانہ جذبہ رکھتے ہیں، نہ کوئی خاص فریقانہ دعویٰ۔ نہ تو اُنھیں کسی خیال اور رائے کی برتری ثابت کر دینے کی پچ ہوتی ہے، نہ کسی خاص خیال اور رائے کو زک دینے کا جوش۔ اُن کی طلب، اُن کی جستجو، اُن کا اعتقاد، اُن کا مشرب، اُن کا حلقہ، اُن کی تمام کدوکاوش کی غرض و غایت، صرف یہی ہوتی ہے کہ حق کی تلاش کی جائے، اور جب مل جائے تو اسے پہچان لیا جائے۔ اِس طریقہ کے رہرو کی ہر بات پچھلے طریقہ سے مختلف ہوتی ہے کیونکہ مقصد اور نظر وفکر کی روح میں بھی اختلاف ہوتا ہے۔ طریقِ جدل پر چلنے والے سچائی کے نہیں بلکہ سچائی کے نام پر جھگڑنے کے شائق ہوتے ہیں۔ اس لیے اُن کی ہر بات میں ایک جھگڑالو اور کج بحث دماغ کی روح پائی جاتی ہے۔ لیکن طریقِ ہدایت کا پیرو کسی حال میں بھی جھگڑالو اور کج بحث نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ اُس کی روح طلبِ حق کی روح ہوتی ہے، اور حق کی طلب اور اُس کی معرفت کا عشق کبھی بحث ونزاع کی نفس پرستیوں کے ساتھ جمع نہیں ہوسکتا۔ فی الحقیقت ان دونوں طریقوں میں نہ صرف اختلاف ہے بلکہ صریح تضاد ہے۔ پہلے کا نتیجہ یہ ہے کہ حق کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

طلب و معرفت کی استعداد ہی طبیعتِ انسانی میں باقی نہیں رہتی۔ دوسرے کا نتیجہ یہ ہے کہ صرف حق ہی کی طلب و معرفت کا استغراق باقی رہ جاتا ہے۔ نفس و ہوس کی تمام غفلتیں اور خود پرستیاں معدوم ہو جاتی ہیں۔

جدل یا ہدایت؟

میں نے پہلے بھی کہا تھا، اور اب پھر آپ کو توجہ دلاتا ہوں کہ اگر سفر کا عزم ہے تو کیوں پہلے ہی سے اپنی گمراہی کا بھی فیصلہ کر لیں؟ کیوں نہ قدم بڑھانے سے پہلے سوچ سمجھ لیں کہ ہمیں کونسی راہ اختیار کرنی ہے؟ راہیں یہاں دو ہی ہیں۔ ایک وہ جسے قرآن نے اپنی بولی میں ''جدل'' کہا ہے۔ دوسری وہ جسے ''ہدایت'' سے تعبیر کیا ہے۔ اگر ''جدل'' کا شوق ہے، تو واقعہ یہ ہے کہ آج دُنیا کے پرستارانِ مذاہب میں ننانوے فی صدی انسان اسی راہ پر گامزن ہیں۔ آپ بھی اس بھیڑ میں شامل ہو جایئے۔ لیکن اگر حق کی طلب اور سچائی کی لگن ہے، تو پھر ضروری ہے کہ دوسری راہ اختیار کی جائے۔ لیکن دوسری راہ اختیار کرنے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ زبان سے اس کا دعویٰ کیا جائے۔ جہاں تک دعوے کا تعلق ہے، کوئی سخت سے سخت مجادل (جھگڑالو) انسان بھی اس دعوے سے دست بردار ہونا پسند نہیں کرے گا۔ چاہیے کہ سچ مچ کو جدل و نزاع کی جگہ سچائی کے ایک سچے اور بے نفس متلاشی کی روح آپ کے اندر پیدا ہو جائے۔ اِس صورت میں آپ کے بحث و مطالعہ کا انداز ہی دوسرا ہو جائے گا۔ جو چیزیں بقول آپ کے آج ''شک وشبہ کا طوفان'' آپ کے اندر پیدا کر دیتی ہیں، اُس حالت میں آپ کے لیے مزید یقین کا پیغام اور معرفتِ حق کا وسیلہ بن جائیں گی!

مذاہبِ عالم بہ اعتبارِ حفظ و عمل:

اگر ایک شخص ''مجادل'' نہیں بلکہ طریقِ ''ہدایت'' پر عامل ہے تو وہ بغیر کسی بحث و اختلاف کے تسلیم کرے گا کہ آج جس قدر مذاہب دُنیا میں موجود ہیں، تعلیمی مصادر کے لحاظ سے اُنھیں تین قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(۱) وہ نہایت قدیم مذاہب جن پر امتدادِ زمانہ سے انقلاب حالت کے ایسے دور گزر چکے ہیں کہ اب اُنھیں اُن کی حقیقی صورت و حالت میں معلوم کرنا نہایت دشوار ہو گیا ہے۔ اُن کی تعلیم کے مصادر محفوظ نہیں ہیں، اُن کی حقیقی تعلیمی روح یک قلم منقلب ہو گئی ہے، اُن کے پیرووں کی عملی زندگی میں حقیقت کا اَب کوئی سراغ نہیں لگایا جا سکتا۔

کسی چیز کی اصلیت و حقیقت معلوم کرنے کے لیے دو طرح کی شہادتیں مل سکتی ہیں: اندرونی اور بیرونی۔ دونوں کا مطلب واضح و معلوم ہے۔ حاجت تشریح نہیں۔ اس قسم کے مذاہب کی حقیقی تعلیم معلوم کرنے کے لیے ہم ان کی اندرونی شہادتوں پر قناعت نہیں کر سکتے، کیونکہ انقلاب حالت کی وجہ سے اُن کے پیرووں کی علمی و عملی زندگی اس درجہ بدل چکی ہے کہ اُس سے حقیقت کی شہادت ملنا متوقع نہیں۔ طالب حقیقت کے لیے ضروری ہے کہ وہ بیرونی شہادتوں کی جستجو کرے۔ اگر کوئی ایسی شہادت مل جائے تو اُس کی روشنی میں اُن کی اندرونی حالت پر نظر ڈالے۔

(۲) دوسری قسم ان مذاہب کی نظر آئے گی جن کی عمر پہلی قسم کے مذاہب سے کم ہے، اور جنھیں نسبتاً اپنی تعلیم کی اشاعت و توسیع کے لیے بہتر زمانہ حاصل ہوا تھا۔ اس لیے اگرچہ ان پر بھی انقلابِ حالت کے وہ تمام دَور گزر چکے ہیں، جو اصلیت کو محرف اور مبدل کر دیتے ہیں اور عملی روح یک قلم مفقود ہو جاتی ہے، تاہم اُن کی تعلیم کے بنیادی سرچشمے اِس حد تک ضرور موجود ہیں کہ ایک طالبِ حق اُن سے اندرونی شہادت حاصل کر لے سکتا ہے، اور تغیر و تحریف کے بے شمار پردے پڑ جانے پر بھی اصلیت کی جھلک نظر آ جاتی ہے۔

البتہ یہ اندرونی شہادت اس درجہ واضح اور قطعی نہیں ہے کہ بیرونی شہادتوں کی ضرورت نہ ہو۔ ضروری ہے کہ کوئی مضبوط شہادت سے باہر بھی حاصل کی جا سکے، ورنہ حقیقت کا قابلِ یقین فیصلہ نہیں ہو سکے گا۔

(۳) اگر ہم نے صحتِ نظر کے ساتھ اِن دونوں قسموں پر نظر ڈال لی ہے، تو ضروری ہے کہ ایک تیسری اور آخری قسم بھی [illegible] کے تمدن و علوم کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اشاعت و تنظیم کے زمانے میں ہوا، اور اس لیے ایسے وسائل اُس کے لیے بہم ہو گئے کہ تعلیمی مصادر کے تلف ہونے یا کمی بیشی سے محرف ہو جانے کا کوئی کھٹکا باقی نہیں رہا۔ جس طرح اُس زمانے میں جبکہ اُس کا نیا نیا ظہور ہوا تھا، اُس کی تعلیم اپنی حقیقی صورت و حالت میں دیکھی جا سکتی تھی، ٹھیک اسی طرح آج بھی ہر آنکھ دیکھ لے سکتی ہے۔ البتہ انقلاب حالت کے وہ تمام دَور جو جمعیتِ بشری کی دماغی و عملی زندگی پر گزرے ہیں، اُس پر بھی گزرے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اُس کے فہم و عمل کی روح روز بروز کمزور پڑتی گئی۔ یہاں تک کہ اُس کی حقیقی تعلیم کے مقابلہ میں، اُس کے پیروؤں کی عملی ذہنیت نے بہ حیثیت مجموعی ایک نئے قسم کا نقشہ پیدا کر دیا۔ تاہم ایک جویائے حقیقت کے لیے اضطراب و تشویش خاطر کی کوئی وجہ نہیں۔ کیونکہ اُس کے تمام تعلیمی مصادر اپنی اصلی حالت میں موجود ہیں، اور وہ اس قدر واضح، اِس قدر مختصر، اس قدر سہل الحصول ہیں کہ ہر طالبِ حقیقت طلب و معرفت کا ایک قدم بڑھا کر اُن تک پہنچ جا سکتا ہے، اور جیسی کچھ بھی اصلیت ہے، اُس کے سامنے روشن ہو جا سکتی ہے۔

چونکہ اِس آخری قسم کے تمام تعلیمی مصادر محفوظ، مدوّن، اور ہر انسان کے دسترس میں ہیں، اِس لیے اس کی حقیقت معلوم کرنے کے لیے کسی بیرونی شہادت کی ضرورت نہیں۔ یہ صرف اپنی اندرونی شہادت ہی سے پہچانی جا سکتی اور پرکھی جا سکتی ہے۔

بلاشبہ اس کی عملی روح امتدادِ زمانہ کے موثرات و عوامل سے متاثر ہو چکی ہے اور اس لیے ''تعلیم'' اور ''عمل'' دو مختلف چیزیں ہو گئی ہیں، تاہم یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اُس کی عملیت کی بنیادیں پچھلی دو قسموں کی طرح منہدم ہو گئیں۔ ایک جویائے حقیقت معلوم کر لے سکتا ہے کہ امتدادِ زمانہ کے یہ تمام تغیرات سطح سے نیچے نہیں اُتر سکے ہیں۔ بنیادیں بدستور قائم ہیں۔

مذاہبِ عالم میں ہندوستان اور ایران کے قدیم مذاہب پہلی قسم میں داخل ہیں۔ یہودی اور مسیحی مذاہب دوسری قسم ہیں۔ تیسری قسم سے مقصود اسلام ہے۔

جویائے حقیقت کا فرض:

اگر ایک شخص کی راہ وہ ارادہ نہیں ہے جسے ''جدل'' سے تعبیر کیا گیا ہے، تو وہ مذاہب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عالم کی اِس صورتِ حال کے اعتراف میں ہرگز تامل نہیں کرے گا، اور اس لیے ''تعلیم'' اور ''عمل'' کا اختلاف، یا حقیقی تعلیم اور غیر حقیقی تعلیم کی موجودگی کبھی اُس کے لیے ''شک و شبہ کا طوفان'' پیدا نہیں کر سکے گی۔ وہ دُنیا کی زیادہ سے زایدہ واضح حقیقتوں کی طرح دیکھے گا کہ پیروانِ مذاہب کا موجودہ عمل وفہم اُن مذاہب کی حقیقی تعلیم کے لیے حجت نہیں ہوسکتا اور یہ ناگزیر ہے کہ جماعت، عمل، اور شخصی ترجمانیوں سے بے اثر ہو کر صرف مذہب اور اُس کی ''تعلیم'' پر اعتماد کریں۔ ورنہ یا تو ہمیں یک قلم مذاہب کے برخلاف فیصلہ کرنا پڑے گا، یا فریقانہ تعصب وانکار میں مبتلا ہو جائیں گے، اور اس طرح فہمِ حقیقت واعتدال رائے کی راہیں ہم پر بند ہو جائیں گی۔

جہاں تک اسلام کا تعلق ہے، شاید ہی دُنیا میں کسی تعلیم کی حقیقت و اصلیت کا ادراک اس قدر آسان اور سہل ہو، جس قدر اسلام کا ہے۔ اوّل یہ کہ اُس کی تعلیمی اصل اس طرح محفوظ اور مرتب دُنیا کے ہر انسان کے دسترس میں ہے، کہ بغیر کسی علمی تحقیق وکاوش کے ہر شخص حاصل کر لے سکتا ہے اور اس کے مطالب سے واقف ہو جا سکتا ہے۔ ثانیاً اُس کے تمام مصادر اِس طرح مسلّم اور طے شدہ ہیں کہ اِس بارے میں کسی اشتباہ کی گنجایش نہیں۔ ثالثاً تعلیمی مصادر کی جتنی بھی مقدار ہے، بہت مختصر ہے۔ اتنی مختصر ہے کہ اگر ایک معمولی درجہ کا تعلیم یافتہ انسان چاہے تو ایک دن کے اندر معلوم کر لے سکتا ہے کہ اسلام کے تعلیمی مصادر کے مطالب کیا کیا ہیں؟ سوال یہ ہے کہ جب ایک تعلیم اس درجہ واضح اور سہل ہمارے سامنے موجود ہو، تو کیا کسی انصاف پسند ''غیر مجادل'' انسان کے لیے جائز ہوسکتا ہے کہ وہ اس کے فہم کے لیے خود اُس پر اعتماد نہ کرے، اور اگر اُس کی تعلیم میں اور بعض انسانوں کے فہم میں اختلاف واقع ہو جائے، تو اپنے آپ کو ''شک وشبہ کے طوفان'' کے حوالے کر دے؟

یہاں تک میں نے صرف اصولی بحث کی ہے۔ اب مجھے آپ کے بعض تأثرات اور پیش کردہ سوالات کا جواب دینا چاہیے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(۳)

یہاں تک میں نے جو کچھ لکھا، وہ اس باب میں ایک اصولی بحث تھی۔ میں نے ابھی اس طرف توجہ ہی نہیں کی ہے کہ جن باتوں کا آپ نے ذکر کیا ہے، اُن کی اصلیت کیا ہے اور وہ فی الحقیقت اسلام کے احکام ہیں یا نہیں؟ میں صرف یہ واضح کرنا چاہتا تھا کہ صورتِ حال کچھ ہی کیوں نہ ہو لیکن آپ کا طریقِ نظر صحیح نہیں ہے۔ آپ اسلام کی حقیقی تعلیم معلوم کرنے کے بعد محض اس وجہ سے اپنے آپ کو ''شک وشبہ'' کے حوالے کر دیتے ہیں کہ ''دوسرے مسلمانوں'' کا فہم وعمل اس کے خلاف نظر آتا ہے۔ ''دوسرے مسلمانوں'' کا یہ بیان کردہ فہم وعمل فی الحقیقت خلاف ہے یا نہیں؟ اس سے بھی ابھی کوئی بحث نہیں۔ سوال یہ ہے کہ ایک جویائے حقیقت انسان جس کا مقصد جدل ونزاع نہیں بلکہ سچائی کی طلب وتحقیق ہے، کیوں راہِ تحقیق میں اصلِ تعلیم چھوڑ کر لوگوں کے فہم وعمل سے متاثر ہو، اور اس کی وجہ سے ''شکوک وشبہات'' میں مبتلا ہو جائے!

بہ حیثیت ایک طالبِ حق وصداقت کے یہ بات پیشتر سے آپ کے علم میں ہونی چاہیے کہ مذاہب کی تعلیم اور پیروانِ مذاہب کا فہم وعمل دو مختلف چیزیں ہوگئی ہیں، ایک چیز نہیں ہیں، اور اس لیے اگر اس طرح کا کوئی اختلاف آپ کے علم میں آتا ہے تو یہ کوئی نیا انکشاف نہیں ہے جس سے آپ حیران وسراسیمہ ہو جائیں، بلکہ پیشتر کی سمجھی بوجھی ہوئی بات کا ایک مزید معائنہ اور تجربہ ہے۔ تجربہ شک وشبہ کا باعث کیوں ہو؟ اس سے تو آپ کے علم ویقین میں اور زیادہ اضافہ ہونا چاہیے؟

دعوتِ قرآنی کی بنیادی اصل:

یہ موقع زیادہ تفصیل وبحث کا نہیں ہے، ورنہ آپ کو بتلاتا کہ جستجوئے حقیقت اور معرفتِ صداقت کی یہی وہ بنیادی اصل ہے، جس کی اب سے تیرہ سو برس پہلے قرآن حکیم نے نوعِ انسانی کو دعوت دی تھی۔ دراصل قرآن کی ساری تعلیم اسی اصل کی شرح ہے۔ قرآن جس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وقت نازل ہوا، اُس وقت دُنیا میں مذاہب کے پیرووں کی کمی نہ تھی، لیکن مذاہب کی حقیقت گم ہو چکی تھی۔ اسی طرح گم تھی، جس طرح آج بھی گم ہے۔ مذاہب کے پیرووں کی بے شمار جماعتیں قائم تھیں، اور ہر جماعت صرف اپنے ہی کو سچائی کی وارث اور ہر دوسری جماعت کو سچائی سے محروم یقین کرتی تھی۔ سچائی کی راہ ایک سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔ اس لیے قرآن کے لیے بہ ظاہر دو ہی طریقے ہو سکتے تھے: یا تو تمام پیروانِ مذہب کی تصدیق کرے یا سب کی تکذیب کرے۔ سب کی تصدیق کی نہیں جا سکتی تھی کیونکہ ہر ایک کا دعویٰ دوسرے سے متضاد تھا۔ ہر جماعت نہ صرف اپنی صداقت کی مدعی تھی، بلکہ دوسرے کے بطلان کی بھی مدعی تھی۔ اس لیے سب کی تصدیق کے معنی یہ تھے کہ سب کو بہ یک وقت حق اور باطل، دونوں تسلیم کر لیا جائے۔ اسی طرح سب کی تکذیب بھی صداقت کے خلاف تھی۔ کیونکہ اس صورت میں دُنیا کا مذہبی صداقت سے خالی ہونا لازم آتا تھا، اور انسان کی روحانی ہدایت و تربیت کی تمام بنیادیں منہدم ہو جاتی تھیں۔ پس اُس نے ان دونوں طریقوں میں سے کوئی طریقہ بھی اختیار نہیں کیا۔ ایک تیسری راہ اختیار کی۔ اُس نے کہا، دُنیا کے تمام مذاہب حق ہیں، لیکن دُنیا کے تمام پیروانِ مذاہب حق سے منحرف ہو گئے ہیں۔ جس قدر بھی گمراہی ہے، جس قدر بھی اختلاف ہے، جس قدر بھی دعووں کی لڑائی اور جماعت بندیوں کا تصادم ہے، پیروانِ مذہب کے فہم و عمل میں ہے، مذاہب کی تعلیم میں نہیں ہے۔ اگر پیروانِ مذہب کا یہ انحراف دُور ہو جائے جو حق نہیں ہے تو ہر جماعت کے پاس وہ چیز باقی رہ جائے گی جو صرف حق ہے، اور چونکہ وہ حق ہے، اس لیے نہ تو اس میں ایک راہ سے زیادہ کی گنجائش ہے۔ نہ کسی طرح کے اختلاف و نزاع کا امکان۔ یہی مذاہبِ عالم کا ''مشترک حق'' دُنیا کی عالمگیر روحانی صداقت ہے اور اسی کو قرآن نے اپنی زبان میں ''اسلام'' اور ''صراط مستقیم'' سے تعبیر کیا ہے:

قولوا امنا باللّٰہ وما أنزل الينا، وما أنزل الى ابراهيم
واسماعيل ويعقوب وللاسباط، وما أوتى موسىٰ و عيسىٰ،
وما أوتى النبيون من ربهم لانفرق بين احد منهم ونحن له

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مسلمون! فان اٰمنو بمثل ما اٰمنتم به فقد اهتدوا، ان تولوا، فانما هم فی شقاق فسیکفیکهم الله، وهو السمیع العظیم!

(۲:۱۳)

”سچائی کی راہ یہ ہے کہ کہو: ہم اللہ پر ایمان لائے ہیں اور اُس سچائی پر ایمان لے آئے ہیں جو ہمارے سامنے پیش کی گئی ہے۔ نیز اُن تمام مذہبی صداقتوں پر ایمان رکھتے ہیں جو ابراہیم پر نازل ہوئیں، اور جن کی اسماعیل و یعقوب اور اُن کی نسل کے رہنماؤں نے دعوت دی اور پھر وہ تعلیم جو موسیٰ کو دی گئی، اور وہ تعلیم جو عیسیٰ کا پیغامِ حق تھا۔ غرضیکہ دُنیا کے سارے نبیوں اور مذہبی صداقت کے سارے معلموں کو خدا کی طرف سے وقتاً فوقتاً جو کچھ ملا ہے، اُس سب پر ہمارا ایمان ہے۔“

ہم اُن سب کو ایک ہی طرح کے یقین اور احترام کے ساتھ قبول کرتے ہیں۔ ہم اُن میں کسی طرح کی تفریق نہیں کرتے کہ ایک کی تصدیق کریں اور دوسرے کو جھٹلائیں۔ ہم خدا کے فرماں بردار ہیں۔ اُس کی سچائی جہاں کہیں اور جب کبھی آئی ہو، ہمارے لیے سچائی ہے اور ہم اُسے قبول کرتے ہیں!

اِس طرح قرآن نے جو طریقہ اختیار کیا، وہ یہ تھا کہ تمام مذاہب کی تصدیق کی، مگر تمام پیروانِ مذاہب کی تکذیب کی، اور اس تصدیق و تکذیب کے اجتماع سے اُس بنیادی صداقت کی راہ نوعِ انسانی پر کھول دی، جس پر چلے بغیر کوئی انسان مذہبی حقیقت کی معرفت حاصل نہیں کر سکتا۔ آج بھی ہر اُس انسان کے لیے جو مذہب کی روحانی صداقت کی طلب رکھتا ہو، اِس راہ کے سوا دوسری کوئی راہ موجود نہیں ہے۔ وہ وقت اب دُور نہیں ہے جب عالمِ انسانیت مذاہبِ عالم کے اختلافات سے اُکتا کر مجبور ہو جائے گا کہ یا تو یک قلم مذہب ترک کر دے یا تمام مذہبی صداقتوں کو جمع کرے [illegible] کہ جمعیتِ انسانی مذہب ترک نہیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کر سکتی۔ اس لیے ناگزیر ہے کہ دوسرا طریقہ اختیار کرے۔ اور جب وہ دوسرا طریقہ اختیار کرے گی، تو فی الحقیقت وہ یہی طریقہ ہوگا جس کی طرف تیرہ سو برس پہلے قرآن نے دعوت دی تھی: یعنی انسانوں کے فہم و عمل کی تکذیب اور اصل مذاہب کی تصدیق۔ اُس وقت دُنیا کے تمام پیروانِ مذاہب یک زبان ہو کر اعلان کریں گے:

> كان الناس أمة واحدة، فَبعثَ اللّٰه النَبِينَ مُبشْرِينَ و مُنذرِين، وَأنزل مَعَهُم الكِتابَ بالحقِ لِيُحُكُم بَين النَّاسِ فِي ما إختلفوا فيه، وَمَا اختلف فيه إلّا الذِينَ اتوه مِن بعدِ ماجأتهُم البيّنَاتِ بغياً بينهم، فهدى اللّٰهُ الذِين آمنوا لِما اختلفُوا فِيه من الحقِ باذنه، واللّٰهُ يِهدِي مَن يَشاء إلى صِراطٍ مُستقيمٍ. (۲:۲۰۹)

> ''دُنیا میں انسانی جمعیت کی ابتداء اختلاف سے نہیں بلکہ وحدت و یگانگت سے ہوئی ہے۔ سب ایک ہی قوم تھے اور سب فطری صداقت کے ایک ہی طریق پر چلنے والے تھے پھر ایسا ہوا کہ ان میں پھوٹ پڑ گئی اور گمراہی و فساد کی بے شمار راہوں میں بکھر گئے۔ تب خدا نے ان کی ہدایت کے لیے نبیوں کو مبعوث کیا جو نیک کرداری کے پھل کی بشارت دیتے تھے اور بدکرداری کے نتائج سے ڈراتے تھے۔ اُن کے ساتھ تعلیم حق کی کتابیں تھیں۔ یہ اس لیے نازل کی گئی تھیں تاکہ جن جن باتوں میں نادانی و گمراہی سے اختلاف اور جھگڑا پیدا کر دیا گیا ہے، ان سب کا فیصلہ ہو جائے اور سب اُس حقیقی دین پر متفق ہو جائیں جس سے منحرف ہو کر ایک دوسرے سے جھگڑنے لگے ہیں۔ افسوس ہے کہ نسلِ انسانی اس پر بھی اختلاف و فساد سے باز نہ آئی۔ جن جن باتوں کے فیصلے کے لیے [illegible] پھر اختلاف پیدا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کر دیا گیا، اور دینِ حق کی حقیقت اور وحدت گم ہو گئی۔ جب ایسا ہوا تو ضروری تھا کہ ایک مرتبہ ان تمام اختلافوں اور گمراہیوں کے خلاف، دینِ حق کی حقیقت کا عام اعلان کر دیا جائے، اور تمام جماعتوں اور مدعیوں کو ایک نقطہ پر جمع کر دیا جائے۔ چنانچہ اللہ نے اپنے فضل و رحمت سے اس کا دروازہ اہلِ ایمان پر کھول دیا، اور وہ جس کو چاہتا ہے ہدایت کی راہ دکھا دیتا ہے!"

مسلمانوں کا پچھلا مظاہرہ:

اب، مَیں اُس خاص معاملہ پر متوجہ ہوتا ہوں، جس کا آپ نے ذکر کیا ہے۔ میں آپ کو بتلانا چاہتا ہوں کہ اس بارے میں آپ نے جس قدر تاثرات قبول کیے ہیں، وہ زیادہ تر اسی اصولی غلطی کا نتیجہ ہیں۔

اس بارے میں آپ نے جو کچھ لکھا ہے، اُس کا خلاصہ یہ ہے کہ آپ تسلیم کرتے ہیں، یہ رسالہ فی الحقیقت نہایت بے ہودہ اور دِلآزار تھا اور اس پر اعتراض کرنے میں مسلمان حق بجانب تھے۔ لیکن آپ کہتے ہیں کہ معاملہ اس حد تک پہنچ کر ختم نہیں ہو گیا۔ بلکہ آپ کے لفظوں میں:

"جو طریقہ مسلمانوں نے ملک کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک اختیار کیا اور جو جو باتیں کہی گئیں، وہ نہ صرف حق و انصاف کے خلاف تھیں بلکہ عجیب طرح کی مذہبی ذہنیت ظاہر کرتی تھیں جنھیں کسی طرح بھی ٹھیک راستہ پر نہیں لے جایا جا سکتا۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ تمام لیڈروں اور مولانا صاحبان نے اور جمیعت العلما نے فتویٰ جاری کر دیا کہ "رنگیلا رسول" لکھنے والے اور چھاپنے والے کو قتل کرنا چاہیے۔ اور یہ کہ اسلام کا قانون یہی ہے کہ جونہی کوئی غیر مسلمان حضرت بانیٔ اسلام کے خلاف بدزبانی کرے، اسے فوراً مار ڈالنا چاہیے۔"

© rasailojaraid.com

میں آپ کی طبیعت کی صداقت اندیشی اور حق جوئی کا معترف تھا اور اس موقع پر بھی

© rasailojaraid.com

معترف ہوں۔ آپ نے اس رسالہ کے متعلق جو رائے قائم کی، اور جس طرح بے لاگ اور قطعی لفظوں میں اپنا خیال ظاہر کر دیا، فی الحقیقت ایک راستی پسند انسان کا یہی شیوہ ہونا چاہیے لیکن جن واقعات کا آپ نے ذکر کیا ہے، افسوس ہے کہ نہ تو ان کی تعبیر صحیح ہے، اور نہ وہ تاثر صحیح ہے جو آپ نے قبول کیا ہے۔ آخری چیز میں وہی اصولی غلطی کام کر رہی ہے جس پر پچھلی سطور میں بحث کر چکا ہوں۔

تعبیر میں آپ نے جو غلطی کی ہے، وہ غلطی عام ہے۔ اور اس ناواقفیت کا نتیجہ ہے جو ایک ہزار سال کی یکجائی کے باوجود ہندوؤں کو اسلام اور مسلمانوں کی نسبت ہے۔ میں نے بارہا خیال کیا ہے کہ اگر کسی ذریعہ سے ہم یہ باہمی ناآشنائی دُور کر دے سکیں، تو باہمی مخالفت اور توحش کی کتنی بڑی مقدار خود بخود دور ہو جا سکتی ہے؟ مگر افسوس ہے کہ اس کا کوئی سامان نہیں ہوتا۔ آپ نے غالباً بعض اخباروں کے مضامین دیکھ کر یہ رائے قائم کر لی کہ ''مسلمان لیڈروں اور جمعیت العلماء نے فتویٰ دے دیا''، لیکن اگر آپ کو مسلمانوں کی اصطلاح ''فتویٰ'' کی حقیقت معلوم ہوتی جو بہت ہی معمولی اور عام ہے، تو کبھی یہ بات آپ کے قلم سے نہیں نکلتی۔ آپ ''لیڈروں'' کے ساتھ ''فتویٰ'' کا لفظ نہ لگاتے۔ آپ سے یہ غلطی بھی نہیں ہوتی کہ اُن تمام باتوں کو جو کسی ''لیڈر'' یا عالم نے عام مجالس کے ایک مقرر ہونے کی حیثیت سے کہی ہیں، یا اپنے اپنے اندازِ طبیعت کے مطابق نرم و گرم خیالات ظاہر کیے ہیں، ''فتویٰ'' قرار دے دیتے۔ بلاشبہ آپ ان تمام باتوں پر اس حیثیت سے نظر ڈال سکتے تھے کہ کہاں تک موزوں ہیں یا غیر موزوں ہیں۔ لیکن اُنھیں ''فتویٰ'' کے لفظ سے تعبیر نہ کرتے۔ کیونکہ یہ فی الحقیقت ''فتویٰ'' نہیں ہیں۔

غالباً آپ کا خیال یہ ہے کہ جب کبھی کسی معاملہ پر ایک مسلمان، مذہبی قسم کی کوئی بات کہے، تو وہ ''فتویٰ'' ہے۔ حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے۔ اس طرح تو وہ ساری باتیں جو مسلمان جلسوں میں کہتے ہیں یا اخباروں میں لکھتے ہیں ''فتویٰ'' ہو جائیں گی۔ ''فتویٰ'' مسلمانوں کے دینی علوم کی ایک اصطلاح ہے، اور اس کا اطلاق صرف اُس بیان پر ہوتا ہے جو ایک مستند عالمِ دین اس حیثیت سے دیتا ہے کہ فلاں مسئلہ میں اس کے نزدیک شریعت کا حکم یہ ہے۔ جب تک

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایک عالمِ شرع اس حیثیت سے ایک بیان نہ دے، وہ فتویٰ نہیں ہے اور کوئی مسلمان بھی اسے فتویٰ نہیں سمجھے گا۔ اب آپ غور کیجیے کہ لیڈروں کی طرف ''فتویٰ'' منسوب کر دینا کیسی افسوس ناک غلطی ہے؟ آپ کہہ سکتے ہیں کہ علماء بھی ''لیڈر'' ہیں۔ یہ ٹھیک ہے، لیکن یقیناً یہاں لیڈر سے مقصود علماء نہیں ہیں۔ مسلمان جماعتوں کے عام سربرآوردہ اشخاص اور سیاسی رہنما ہیں، اور یقیناً نہ تو وہ ''فتویٰ'' دیتے ہیں، نہ مسلمانوں میں کوئی شخص اُن کے بیانات کو فتویٰ کی حیثیت سے قبول کرتا ہے۔

البتہ جمعیت العلماء مذہبی حیثیت سے ''فتویٰ'' دے سکتی ہے، لیکن یہ خیال صریح غلط ہے کہ جمعیت العلماء نے ''رنگیلا رسول'' کے لکھنے والے یا چھاپنے والے کی نسبت کوئی ''فتویٰ'' جاری کیا۔ یہاں پھر وہی باہمی ناواقفیت اور ناآشنائی کی بَلا آ گئی ہے جو ہندو مسلمانوں کے تمام معاملات پر چھائی ہوئی ہے۔ چونکہ مسلمانوں کی مذہبی اصطلاح ''فتویٰ'' کی حیثیت اور نوعیت پر آپ کی نظر نہیں، اس لیے طرح طرح کی غلط فہمیاں پیدا ہو رہی ہیں۔ غور کیجیے، اِس ایک معاملہ میں یکے بعد دیگرے کتنی غلطیاں پیدا ہوگئی ہیں:

اولاً، مسلمانوں میں شرعی حیثیت سے فتویٰ اسی وقت دیا جاتا ہے جب کسی خاص معاملہ میں شرعی حکم واضح کرنا ہو، تاکہ مسلمانوں کا کوئی فرد یا جماعت اس پر عمل کرے۔ موجودہ صورت میں ''فتویٰ'' کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ ہندوستان میں ایک شخص نے اسلام کے خلاف دلآزار کتاب لکھی تھی اور شائع کی تھی۔ یہاں نہ تو مسلمانوں کی حکومت ہے، نہ شرعی قوانین نافذ ہیں، نہ مسلمانوں کے مذہبی گروہ کو کسی طرح کا دخل سیاست و تعزیر میں ہے۔ جو کچھ بھی اس بارے میں کر سکتی ہے، حکومت کر سکتی ہے۔ اگر کوئی شخص اس میں مداخلت کرے گا مجرم ہوگا۔ پس ظاہر ہے کہ اس معاملہ میں مسلمانوں کے فتویٰ لینے یا دینے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ہاں یہ ممکن تھا کہ کوئی شخص اس درجہ مجنوں یا احمق ہو جائے کہ وہ خیال کرے، ہندوستان میں اسے تعزیر و سیاست کے احکام جاری کرنے کی قدرت حاصل ہوگئی ہے اور اس لیے فتویٰ دینا شروع کر دے کہ فلاں آدمی کو قتل کر ڈالنا چاہیے، اور فلاں آدمی کو قید میں ڈال دینا چاہیے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لیکن واقعہ یہ ہے کہ ایسا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔

ثانیاً جمعیت العلماء کی نسبت یہ سمجھ لینا کہ چونکہ وہ علماء کی انجمن ہے، اس لیے اُس کی جانب سے جو کچھ بھی کہا جاتا ہے، ''فتویٰ'' ہے، کس درجہ ناواقفیت کی بات ہے؟ وہ ایک انجمن ہے اور اس حیثیت سے وہ تمام طریقے اظہارِ رائے کے عمل میں لاتی ہے جو دُنیا کی تمام انجمنیں عمل میں لایا کرتی ہیں۔ مثلاً اگر کوئی ایسا معاملہ پیش آ جاتا ہے جس پر وہ کارروائی کرنا ضروری سمجھتی ہیں، تو تجویز کی شکل میں کوئی بات ترتیب دیتی ہے اور اسے منظور کر کے شائع کر دیتی ہے۔ اس معاملہ پر بھی اُس نے ایک تجویز منظور کی، اور غالباً لاہور میں اپنی جمعیۃ عاملہ (ورکنگ کمیٹی) کا ایک جلسہ کر کے اُس کا اعلان کر دیا۔ وہ جمعیت العلماء کی ایک تجویز ہے۔ یقیناً لوگوں نے اُسے اُس درجہ اہمیت دی ہوگی، جس درجہ اہمیت وہ جمعیت العلماء کی تجاویز کو دیا کرتے ہیں، لیکن وہ ''فتویٰ'' نہیں ہے۔ کیونکہ ''فتویٰ'' دینے کی اس معاملہ میں گنجائش ہی نہ تھی۔ آپ جمعیت کی ایک تجویز کو ''فتویٰ'' کہہ رہے ہیں۔

ثالثاً، جمعیت العلماء کی اس تجویز کا مضمون بھی آپ نے صحیح طور پر معلوم نہیں کیا ہے، اور جو کچھ لکھا ہے، وہ اصلیت سے اس درجہ ہٹا ہوا ہے کہ اگر میں آپ کو ملامت کروں تو آپ کو ناخوش نہیں ہونا چاہیے۔ کم از کم آپ جیسی طبیعت کے آدمی کو ایک واقعہ کے نقل کرنے میں اس درجہ بے احتیاط نہیں ہونا چاہیے تھا۔ جمعیت العلماء کی تجویز تمام اخباروں میں شائع ہو گئی تھی۔ میری نظر سے بھی گزری تھی۔ اگر آپ چاہیں تو اس وقت کا کوئی اُردو اخبار حاصل کر کے دیکھ لے سکتے ہیں۔ اُس میں یہ کہیں نہیں ہے کہ ''رنگیلا رسول'' لکھنے والے اور چھاپنے والے کو قتل کر دینا چاہیے، جیسا کہ آپ نے لکھا ہے۔ کم سے کم اتنی بات تو ہر شخص کی سمجھ میں آ جانی چاہیے کہ برٹش انڈیا میں کوئی شخص یا جماعت اپنے آپ کو گرفتار کرائے بغیر کسی انسان کے قتل کی اعلانیہ ترغیب نہیں دے سکتی۔ اگر جمعیت نے یا کسی انجمن نے ایسا اعلان کیا ہوتا تو یہ صریح ایک انسان کے قتل کا اقدام تھا۔ دراصل وہ تجویز مسلمانوں سے مخاطب کر کے لکھی ہی نہیں گئی تھی کہ اس طرح کی قاتلانہ ترغیب کی اس میں گنجائش ہوتی۔ اس کا تمام تر خطاب حکومت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے تھا۔ حکومت سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ اس طرح کے دلآزار حملوں کا سدِّ باب کرے، اور اگر موجودہ قوانین اس کے لیے کافی نہیں ہیں تو نیا قانون نافذ کر دے۔ البتہ اُس تجویز میں اس بات کا حوالہ ضرور تھا کہ اسلامی قوانین میں (یا بصورت اسلامی حکومت ہونے کے، مجھے اصلی الفاظ یاد نہیں ہیں) ایسے شخص کی سزا قتل ہے جو پیغمبرِ اسلام کی عمداً توہین وتذلیل کرے۔ یہ حوالہ جس طریقہ سے دیا گیا تھا۔ اس کا صاف منشا یہ تھا کہ معاملہ کی اہمیت حکومت پر واضح ہو جائے۔ یعنی یہ بات اُس کے علم میں آ جائے کہ مسلمانوں کے دینی احساسات اس بارے میں کیا ہیں، اور ان کے نقطۂ خیال سے یہ معاملہ کس درجہ اہم اور ضروری ہے؟ بلاشبہ اس پر بحث کی جا سکتی ہے کہ اس موقع پر اس قانون کا حوالہ دینا یا ذکر کرنا کہاں تک صحیح تھا؟ اور فی الحقیقت اسلام کا قانون کیا ہے؟ اس بارے میں میری رائے اور اسلامی قوانین کی حقیقت کی بحث آگے آئے گی اور آپ معلوم کر لیں گے کہ میرا خیال اور علم کیا ہے، لیکن بہ حیثیت ایک صداقت اندیش انسان کے آپ کو اور اُن تمام لوگوں کو جو اس بارے میں طرح طرح کے تاثرات قبول کر رہے ہیں، یہ تسلیم کر لینا چاہیے کہ واقعہ کی نوعیت وہ نہیں ہے جو اُنھوں نے سمجھ رکھی ہے۔ ہم ایک معاملہ کی نسبت موافق رائے رکھتے ہوں یا مخالف، ہر حال میں ہمارا فرض ہے کہ ہر معاملہ کو اس کی صحیح اور حقیقی صورت میں دیکھیں، اور جیسا کچھ بھی وہ ہی، اُسے تسلیم کر کے، رائے قائم کریں۔ انصاف کیجیے، کہاں یہ بات کہ جمعیت العلماء نے ایک تجویز منظور کر کے حکومت کو صورتِ حال پر توجہ دلائی اور اس میں اس بات کا حوالہ دیا کہ اسلامی قانون اس بارے میں یہ تھا، اور کہاں اُس کی یہ تعبیر کہ "جمعیت نے فتویٰ دے دیا کہ قتل کر دینا چاہیے"؟ اس وقت دُنیا کے کسی مذہب کے ماننے والے بھی ایسے نہیں ہیں جنھوں نے گذشتہ زمانے میں اپنے اپنے وقت کے مصالح کے مطابق قتل وتعزیر کے احکام نافذ نہ کیے ہوں اور وہ ان کی کتابوں میں ثبت نہ ہوں۔ مختلف موقعوں پر بے محل یا بامحل اُن کا ذکر بھی کر دیا جاتا ہے، لیکن کوئی شخص اُس کا مطلب یہ نہیں سمجھتا کہ بحالت موجودہ انھیں نافذ کرنا مقصود ہے۔

رابعاً آپ [illegible] جن لفظوں [illegible] جمعیت کے [illegible] قانون کی تعبیر کی ہے،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وہ بھی صحیح نہیں ہیں۔ آپ لکھتے ہیں ''اسلام کا یہ قانون ہے کہ جونہی کوئی غیر مسلمان حضرت بانی (داعی) اسلام کے خلاف کوئی بدزبانی کرے، فوراً اسے مار ڈالنا چاہیے'' لیکن آپ یقین کیجیے کہ نہ تو جمعیت العلماء کی تجویز میں اس قانون کی یہ تعبیر تھی، اور نہ میری معلومات میں کسی مسلمان نے بھی یہ تعبیر کی ہے۔ جمعیت نے یا کسی دوسری جماعت نے اگر یہ کہا ہے کہ اسلامی حکومتوں کا یہ قانون تھا، تو اس کا صاف مطلب وہی ہوسکتا ہے جو حکومتوں کے قوانین کا عام طور پر ہوتا ہے، یعنی اُن کے قوانین کی رو سے یہ ایک ایسا جرم تھا جو اگر عدالتی تحقیقات کے بعد ثابت ہو جائے تو اس کے لیے قتل کی سزا دی جا سکتی تھی۔ اس کا یہ مطلب کہاں سے نکالا گیا کہ ''جو مسلمان کسی کو بدزبانی کرتے دیکھے اسے فوراً قتل کر ڈالے۔'' اسلام کے شرعی نظم کی رُو سے تو کسی جرم کے لیے بھی ایسی اَنارکی جائز نہیں ہوسکتی۔ تعزیر اور سیاست کے تمام احکام کا تعلق قضا سے ہے۔ یعنی آج کل کی بول چال میں عدالتی کارروائی سے۔ کسی فرد کو بھی اپنی جگہ اختیار نہیں کہ قانون اپنے ہاتھ میں لے لے۔ اور جس کسی کو اپنے نزدیک مجرم سمجھے سزا دے دے۔ یہ کام صرف حکومت اور عدالت کا ہے۔ اگر کوئی شخص ایسا کرے گا، تو وہ اسلامی قوانین کی رُو سے اُسی طرح سزا کا مستحق ہوگا، جس طرح ایک قانون کی خلاف ورزی کرنے والا مجرم ہوسکتا ہے۔

میں نے اس حصۂ بیان میں ضرورت سے زیادہ تفصیل اس لیے کی کہ میں چاہتا ہوں، یہ بات آپ پر واضح ہو جائے کہ واقعات کے مطالعہ و بیان میں وقت کی کوتاہیوں اور کج اندیشیوں کا کیا حال ہے؟ کس طرح ایک بات بغیر کسی اشتباہ اور پیچیدگی کے، محض اس لیے کچھ سے کچھ ہو جاتی ہے کہ ہم ایک دوسرے کو سمجھنے اور بے لاگ طریقہ سے معاملات پر نظر ڈالنے کی استعداد کھو چکے ہیں، اور جب کبھی کسی معاملہ پر بحث کرتے ہیں تو اس کی بالکل کوشش نہیں کرتے کہ احتیاط اور انصاف کے ساتھ قدم اُٹھائیں۔ ہندوستان میں تقریباً ۵ برس سے ہندو مسلمانوں کی موجودہ کش مکش شروع ہوئی ہے۔ اگر ان ۵ برسوں کے وہ تمام بیانات اور مباحث جمع کر لیے جائیں جو ایک فریق نے دوسرے کے اقوال و اعمال کی نسبت بیان کیے ہیں، اور پھر ان پر انصاف اور صداقت [illegible] وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نصف سے زیادہ مقدار اُن باتوں کی نکلے گی جو کبھی فتنۂ وفساد کی صورت نہ اختیار کرتیں اگر واقعات کے مطالعۂ وبیان میں انصاف ودیانت کا تھوڑا سا بھی لحاظ رکھا جاتا۔

(۴)

اب کہ ایک عرصہ کی علالت کے بعد اس قابل ہوا ہوں کہ الہلال کے لیے وقت نکال سکوں، سب سے پہلے مجھے ان صفحات کی ایک ناتمام بحث مکمل کر دینی چاہیے…

فقۂ اسلامی کے تعزیری قوانین:

قبل اس کے اصل سوال کا جواب دیا جائے، دو باتیں بطور مقدمہ کے صاف کر دینی ضروری ہیں:

(۱) جب کبھی تعزیر وسیاست کے کسی ایسے معاملہ میں جیسا کہ یہ معاملہ ہے، اس طرح کی تعبیر بیان اختیار کی جاتی ہے کہ ''اسلام کا قانون یہ ہے'' اور ''شریعتِ اسلامی کا حکم یہ ہے'' تو قدرتی طور پر ان تمام لوگوں کو جو اسلام کے نظامِ شرع سے واقفیت نہیں رکھتے، ایک سخت غلط فہمی واقع ہو جاتی ہے۔ وہ خیال کرتے ہیں کہ جس طرح اسلام نے اپنے پیرووں کو نماز پڑھنے اور روزہ رکھنے کا حکم دیا ہے، اُسی طرح تعزیر وسیاست کے بھی یہ احکام دیئے ہیں۔ مثلاً جب ایک غیر مسلم سُنتا ہے کہ ''اسلام کے قانون میں پیغمبرِ اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کی توہین کرنے والے کی سزا قتل ہے'' تو وہ خیال کرتا ہے کہ اسلام نے اپنے پیرؤں کو حکم دیا ہے کہ جہاں کوئی غیر مسلم ایسی بات منہ سے نکالے جس سے ان کے خیال میں توہین ہوتی ہو، تو فوراً چاقو نکالیں اور اس کا گلا کاٹ کے رکھ دیں! حالانکہ اسلام کی نسبت ایسی مجنونانہ تعلیم کا تصور بھی کرنا، اُس کے خلاف سخت سے سخت اتہام ہے۔ نعوذ باللہ اگر اسلام کی ایسی تعلیم ہو، اور اس نے اپنے پیرووں کو قتلِ انسانی کا عام پروانہ دے دیا ہو۔ اسلام کے نزدیک تو انسان کی زندگی سے بڑھ کر دُنیا کی کوئی چیز بھی محترم نہیں۔ وہ قتلِ نفس کو انسان کی سب سے بڑی شقاوت قرار دیتا ہے۔ اُس کی کتاب اپنے [illegible] نوعِ انسانی کے کسی ایک فرد کا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قتل، فرد کا قتل نہیں ہے، نوع کا قتل ہے:

من قتل نفساً بغیر نفسٍ او فسادٍ فی الارض، فکانما قتل الناس جمیعا، ومن أحیاھا، فکانّما أحیا النّاسَ جَمیْعا، وَلَقَد جاتھم رسلنا بالبینات، ثم ان کثیراً منھم بعد ذالک فی الارض تسرفون. (۵:۳۵)

''جس کسی نے کسی انسان کو بغیر اِن دو حالتوں کے کہ قصاص لینا ہو یا قتل و خونریزی اور ظلم و فساد روکنا ہو، قتل کر ڈالا، تو وہ صرف ایک جان ہی کا قاتل نہیں ہے بلکہ تمام انسانوں کا قاتل ہے۔ اور اس طرح جس کسی نے ایک انسان کو ہلاکت سے بچالیا، تو اُس نے صرف ایک فردِ انسانی ہی کی جان نہیں بچائی، بلکہ تمام نوعِ انسانی کو زندگی بخشی۔

بلاشبہ اسلام نے خاص خاص صورتوں میں قتل کی اجازت دی ہے۔ صرف اجازت ہی نہیں دی ہے بلکہ بغیر کسی جذبۂ اعتذار کے کہا جا سکتا ہے کہ ترغیب دی ہے، لیکن وہ صورتیں وہی ہیں جن میں نہ صرف اسلام نے بلکہ دُنیا کے عالمگیر اخلاق و انسانیت نے بھی قتل انسانی کے ناگزیر ہونے کا اعتراف کیا ہے۔ قتلِ انسانی کی یہ ناگزیر صورتیں اس لیے گوارا نہیں کی گئی ہیں کہ انسانوں کا قتل کیا جائے، بلکہ اس لیے کہ انسانوں کو بچایا جائے:

ولکم فی القصاص حیاۃ یا أولی الألْباب! (۲: ۱۷۹)

''ایسا قتل جو قاتلوں سے انسانوں کو بچانے کے لیے ہو، اگرچہ بظاہر خون بہانا ہے، لیکن فی الحقیقت اسی میں انسانی زندگی کی حفاظت پوشیدہ ہے۔

قرآن بتلاتا ہے کہ یہ ناگزیر صورتیں تین ہیں: جنگ، قصاص اور ایسے جرائم کا انسداد جن کا انسداد بغیر انتہائی سزا کے ممکن نہیں ہے۔ ان صورتوں کے علاوہ کسی حال میں بھی اسلام

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خدا کی اُس بنائی ہوئی مخلوق کا خون بہانا برداشت نہیں کرسکتا جس کا نام انسان ہے۔ جو شخص اس سے زیادہ قتلِ انسانی کا جواز اُس کی طرف منسوب کرتا ہے، وہ یا تو اسلام سے قطعاً بے خبر ہے، یا اسلام پر تہمت لگانے میں اُسے عار نہیں!

بہرحال تعزیری احکام وقوانین کی یہ تعبیر اُن لوگوں کے لیے جو اسلام کے نظامِ شرع سے واقفیت نہیں رکھتے، سخت غلط فہمی کا باعث ہو جاتی ہے۔ وہ نہیں سمجھ سکتے کہ ان کے اسلامی قانون ہونے کے معنی کیا ہیں؟ اور اُن کی نوعیت عقاید وعبادات کے شرعی احکام سے کس درجہ مختلف ہے؟ بلاشبہ تعزیر وسیاست کے بے شمار احکام ہیں جو فقہاءِ اسلام نے یعنی مسلمان قانون سازوں نے وقتاً فوقتاً وضع کیے، اور مختلف عہدوں میں اُن وقتوں کے احوال وظروف کے مطابق اُن کا اجراء ونفاذ ہوتا رہا۔ یہ تمام قوانین آج بھی قانونِ اسلام کی کتابوں میں موجود ہیں، اور اُنھیں اسلامی قانون ہی کہا جاتا ہے، کیونکہ وہ اسلام کے اصولی اور اجمالی مبادیات ہی سے نکالے گئے ہیں۔ لیکن اُن کے ''اسلامی قانون'' ہونے کی نوعیت وہ نہیں ہے، جس نوعیت کے قوانین عقائد وعبادات کے ہیں۔ دونوں کا فرق کئی حیثیتوں سے واضح ہے:

اولاً، تعزیر وسیاست کے تفصیلی قوانین کا بڑا حصہ براہِ راست شریعت کا ٹھہرایا ہوا نہیں ہے، بلکہ قانون سازی کے طریقوں پر شرعی اصول و مبادیات سے استنباط کیا ہوا ہے۔ اس بارے میں اسلام نے جو نظامِ تشریع اختیار کیا تھا، وہ یہ نہیں تھا کہ نپولین کے فرانسیسی مجموعۂ قوانین یا تعزیراتِ ہند کی طرح اُس نے تمام تفصیلی اور جزئی قوانین کا ایک مجموعہ بنا کر نافذ کر دیا ہو۔ اگر وہ ایسا کرتا، تو دُنیا کا عالمگیر مذہب نہ ہوتا۔ محض کسی ایک قوم اور عہد ہی کا مذہب ہوسکتا تھا۔ پس اُس نے جو طریقہ اختیار کیا وہ یہ تھا کہ تفصیلات و جزئیات سے قطع نظر کر لی گئی، اور صرف ایسے اصولی اور اجمالی مبادیات وضع کر دیئے گئے، جن سے حسبِ ضرورت ہر طرح کے تفصیلی قوانین کا استخراج کیا جا سکتا ہے۔ اصلِ شرعی اس بارے میں یہ تھی کہ جمعیتِ بشری کی استعداد ضرورت کے مطابق عدل وسعادت کا نظام قائم رہے، اور مفاسد کے روک تھام اور مصالح کے حصول کے لیے جن [illegible] صحیح طریقہ پر کام میں لائے جا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سکیں۔ اسلامی حکومت کی ابتدا ایک محدود رقبہ اور محدود احوال وظروف میں ہوئی تھی۔ اس لیے تعزیر و سیاست کی تفصیلات میں بھی زیادہ پھیلاؤ نہیں ہوا تھا۔ پھر جوں جوں دائرۂ اقتدار وسیع ہوتا گیا اور تعزیر و سیاست کی نئی نئی ضرورتیں پیش آتی گئیں، مقنّنین اسلام تفصیلی قوانین کا استنباط بھی کرتے گئے۔ یہاں تک کہ ہر طرح کے تعزیری قوانین کا ایک مکمل ذخیرہ مدوّن ہوگیا۔ پس اگرچہ یہ تمام تفصیلی قوانین بھی اپنی اصل کی بنا پر شرعی قوانین ہیں، لیکن یہ ظاہر ہے کہ اسلام کے براہِ راست احکام نہیں ہیں، اور اسلام کے براہِ راست احکام میں اور قانون سازوں کے استنباط کیے ہوئے احکام میں جو بنیادی فرق ہے، اُسے نظرانداز نہیں کرنا چاہیے۔ اسلام کی طرف دونوں کی نسبت، ایک طرح کی نسبت نہیں ہوسکتی، پہلے قسم کے احکام اس کے براہِ راست ٹھہرائے ہوئے ہیں۔ دوسری قسم کے قوانین مقنّنین کے استنباط کیے ہوئے ہیں، اور بسا اوقات اُن میں اور اسلامی اصول ومبادیات میں بیشمار کڑیاں نظر وتفریع اور قیاس واستخراج کی واقع ہوگئی ہیں۔

ثانیاً، یہ بات بالکل کھلی ہوئی ہے کہ یہ قوانین تعزیر و سیاست کے قوانین تھے، اور تعزیر وسیاست کے قوانینِ سلطنت کے لیے ہوتے ہیں، عام افرادِ اُمت کے لیے نہیں ہوتے۔ یعنی نماز روزہ کے احکام کی طرح اِن کا خطاب افراد سے نہیں تھا۔ اسلامی سلطنت سے تھا۔ نماز روزہ کے احکام واجبات وفرائض ہیں، اِس لیے ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ اُنھیں اَدا کرے۔ لیکن یہ احکام تعزیر وسیاست کے قوانین ہیں۔ واجبات وفرائض نہیں ہیں۔ اِس لئے صرف اُسی حالت میں قابلِ عمل ہو سکتے ہیں جبکہ کوئی اسلامی حکومت موجود ہو، اور وہ اپنی عدالتوں میں انہیں نافذ کرے۔ اسلام نے احکامِ قضاء پر (جسے آج کل کے اُردو اخباروں کی زبان میں ''عدالتی کارروائی'' کہنا چاہیے) اِس قدر زور دیا ہے کہ شاید ہی اُس عہد میں دُنیا کی کسی قانونی حکومت نے اس قدر زور دیا ہو۔ اسلام کا نظمِ سیاست یہ ہے کہ ''جرم'' اور ''تعزیر'' ایک ایسی چیز ہے جس کی تشخیص اور حکم ہر حال میں صرف عدالت ہی کے ہاتھ میں ہے۔ عدالت کے سوا کوئی نہیں جسے کسی انسان کو ''مجرم'' قرار دینے اور ''سزا'' دینے کا اختیار ہو۔ عدالت سے بھی مقصود محض کوئی [illegible] تحقیق وحکم کے وہ تمام

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مراتب ہیں جن کے مطابق حاکمِ عدالت کو کارروائی کرنی چاہیے۔ اگر کسی معاملہ میں یہ تمام عدالتی کارروائی نہیں ہوئی ہے، تو خلیفۂ وقت کو بھی اختیار نہیں ہے کہ اَپنے علم اور مشاہدہ کی بنا پر کسی مجرم کو سزا دے دے۔ اگر خلیفۂ وقت کے ذاتی علم و مشاہدہ میں کسی شخص کا کوئی جرم آ گیا ہو، تو اُس کی حیثیت محض ایک مدعی یا گواہ کی ہوگی۔ اِسی حیثیت سے اُسے عدالت کے سامنے کھڑا ہونا چاہیے۔ یہ عدالت کا کام ہے کہ اُس کے دعوے یا گواہی کی نسبت رائے قائم کرے۔

موجودہ زمانے کی قانونی اصلاحات میں بہت زیادہ زور اِس اصل پر دیا جاتا ہے کہ عدالتی اختیارات انتظامی اختیارات سے علیحدہ کر دیئے گئے ہیں۔ یعنی جو قوت ''سزا'' کے نافذ کرنے کا اِقتدار رکھتی ہے، اُسے ''مجرم'' قرار دینے کا اختیار نہیں ہیں، اور اس ایک بنیادی اصلاح نے حاکمانہ اور شخصی ناانصافیوں کے بے شمار راہیں بند کر دی ہیں۔ بلاشبہ یہ ایک عظیم اصلاح ہے لیکن دُنیا کو معلوم نہیں کہ ساتویں صدی مسیحی میں جبکہ دُنیا کے سب سے بڑے متمدن ملک روم کے قوانین کا یہ حال تھا کہ ایک ہی شخص بہ حیثیت مجسٹریٹ کے ملزم پر الزام بھی عائد کرتا تھا اور بہ حیثیت جج کے اُسے سزا بھی دے دیتا تھا۔ اسلامی حکومت میں نہ صرف عدالت کے اختیارات انتظامی مناصب سے الگ تھے، بلکہ اسلامی عدالتوں کو وقت کے حاکموں، گورنروں، درخود پادشاہوں پر بھی حکم دینے اور بلا ردّ و رعایت سزا تجویز کرنے کا اختیار حاصل تھا۔ ویسا ہی اختیار، جیسا اختیار وہ ایک عام باشندۂ ملک کے لیے سزا تجویز کرنے کا رکھتے تھے!

اسلام نے تعزیر و سیاست کے باب میں عدالت کے نظام کو جس قدر اہمیت دی ہے، اُس کا اندازہ صرف اِس بات سے کر لیا جا سکتا ہے کہ مسلمان قانون سازوں میں ایک بڑی جماعت اِس طرف گئی ہے کہ کوئی آقا اپنے نوکر اور غلام کو بھی بطور خود سزا نہیں دے سکتا، اگرچہ قصور کتنا ہی بڑا اور سزا کتنی ہی ہلکی ہو۔ اُسے چاہیے کہ باقاعدہ عدالتی چارہ جوئی کرے!

ظاہر ہے کہ تعزیر و سیاست کے بارے میں جس قانون کا یہ حال ہو، کیونکر باور کیا جا سکتا ہے کہ وہ عدالتی اور آئینی نظم کے علاوہ کسی حال میں بھی سزا کا دینا جائز رکھ سکتا ہے۔ خصوصاً قتل کی سزا جو [illegible] موجود ہوتی، اور بغیر کسی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ادنیٰ تغیر کے وہی قوانینِ سیاست نافذ ہوتے جو ساتویں اور آٹھویں صدی مسیحی میں دمشق اور بغداد کی عدالتوں میں نافذ تھے، اور ایسا ہوتا کہ ایک مسلمان ایک ذِمّی (غیر مسلم شہری) کو قتل کر ڈالتا تو یقیناً وہ اُسی طرح قتلِ عمد کا مجرم قرار دیا جاتا، جس طرح دُنیا کی تمام عدالتوں کے نزدیک قرار دیا جا سکتا ہے۔ ایک لمحہ کے لیے بھی کوئی مسلمان یہ خیال نہیں کر سکتا تھا کہ اُس نے ایک غیر مسلم انسان کا خون بہا کر اسلام کا کوئی مقدس فرض انجام دیا ہے۔

غرضیکہ تعزیر و سیاست کے قوانین کا ''اسلامی قانون'' ہونا وہ نوعیت نہیں رکھتا، جو نوعیت اسلام کے شرعی واجبات و فرائض کی ہے، اور چونکہ اِس طرح کی تعبیر طرح طرح کی غلط فہمیاں پیدا کر دیتی ہے، اس لیے چاہیے کہ تعبیر و بیان میں احتیاط سے کام لیا جائے۔ بہتر اور واضح تعبیر اِس طرح کے قوانین کے لیے یہ ہے کہ اُنھیں اسلامی حکومت کے قانون سے تعبیر کیا جائے۔ یا یوں کہا جائے کہ فقہاءِ اسلام نے اس طرح کا قانون قرار دیا تھا۔

(۲) دوسری بات قابلِ غور یہ ہے کہ فقۂ اسلامی کے قوانین اِس بارے میں کچھ ہی کیوں نہ ہوں، لیکن کیا بحالت موجودہ اُن کا ذکر موزوں اور برمحل ہوسکتا ہے؟ کیا یہ طریقہ ٹھیک ہے کہ اِس قسم کے مواقع پر اُن کا حوالہ دیا جائے اگرچہ وہ حوالہ حکومت کے مقابلہ ہی میں کیوں نہ ہو؟ مجھے بغیر کسی تامّل کے اِس کا جواب نفی میں دینا ہے۔ میرے خیال میں جن لوگوں نے اس موقعہ پر اس قانون کا حوالہ دیا، اُنھوں نے نہ صرف ایک غیر ضروری بات کہی، بلکہ بے محل اور غیر متعلق بات کہی، اور جب کبھی کوئی بات بے موقعہ اور غیر متعلق کہی جائے گی، تو یقیناً طرح طرح کی غلط فہمیوں اور پیچیدگیوں ہی کا باعث ہوگی۔ صلاحِ کار اور مصالحِ وقت کے مطابق نہ ہوگی۔ خود اسلام کے شرعی ادابِ حکم و اِفتا کے بھی یہ خلاف ہے کہ غیر عملی اور غیر وقوعی صورتوں کا ذکر کیا جائے۔ یہ جو آئمۂ سلف کی نسبت جابجا منقول ہے کہ بعض دقیقہ سنجانِ فقہ کی ایسی کاوشیں ناپسند کرتے تھے جن میں غیر وقوعی صورتیں پیدا کر کے بحثیں کی جاتی تھیں، تو اس کا بھی مطلب یہی تھا۔ کہنے کے لیے ہر موقعہ پر ہزاروں باتیں سامنے آ جاتی ہیں۔ ایک اِسی قانون پر کیا موقوف ہے؟ سینکڑوں قوانین دوسرے ... کتابوں میں بھرے پڑے ہیں،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لیکن یہ تو نہیں ہونا چاہیے کہ ہم ہندوستان کی موجودہ زندگی میں اُن کا بغیر کسی مناسبت کے حوالہ دیتے پھریں۔ خود اسلام کا نظمِ شرع یہ ہے کہ ہر موقعہ اور حالت کا جو حکم ہو، وہی وقت کا اصلی حکم ہوگا۔ اُس کے خلاف جو کچھ ہے، وہ وقت کا حکم نہیں ہے۔ پس جب ایک بات موجودہ حالت سے شرعاً تعلق ہی نہیں رکھتی، تو اُس کا ذکر کرنا اور اُسے بناء کار قرار دینا کیونکر صحیح ہوسکتا ہے؟

یہ ظاہر ہے کہ فقۂ اسلامی کے جس قدر تعزیری قوانین غیر مسلموں کے متعلق ہیں، وہ سب ایک خاص قسم کی صورتِ حال سے تعلق رکھتے تھے۔ یعنی یہ کہ اسلامی حکومت ہو، اُس نے غیر مسلموں کی حفاظتِ جان و مال کا ذمہ لیا ہو، اور ذمّیوں کے متعلق جو معاملات پیش آئیں، اُن میں اسلامی عدالتیں اپنے احکام نافذ کرسکیں۔ لیکن اب سرے سے وہ صورتِ حال باقی ہی نہیں ہے۔ نہ تو ہندوستان میں اسلامی حکومت ہے، نہ شرعی ذمہ ہے، اور نہ ذمّی ہیں۔ پس فی الحقیقت اُن قوانین کا موجودہ حالت سے کوئی تعلق ہی نہیں رہا۔ غیر مسلموں کو کس معاملہ میں سزا دینی چاہیے اور کس میں نہیں دینی چاہیے؟ یہ بات تمام تر اس اصل پر مبنی تھی کہ اسلامی حکومت نے فتح یا معاہدہ کے بعد غیر مسلموں کی حفاظت کا ذمہ لیا تھا، اور انھیں خاص شرائط پر ہر طرح کے شہری حقوق عطا کردیئے تھے۔ چونکہ حکومت نے ذمہ لیا تھا، اِس لیے یقیناً اُسے یہ حق بھی حاصل تھا کہ اپنے قوانین و عدالت کے ذریعہ اُن کے معاملات کا فیصلہ کرے، اور اگر وہ ظلم و تعدی پر اُتر آئیں تو اُنھیں سزا دے۔ لیکن اگر اسلامی حکومت موجود نہیں ہے، اور نہ غیر مسلموں کا ذمہ باقی رہا ہے، تو ظاہر ہے کہ یہ تمام قوانین یک قلم غیر متعلق ہوجاتے ہیں۔ کیونکہ اب وہ ذمہ ہی باقی نہ رہا جس پر تعزیر و سیاست کے تمام قوانین مبنی تھے، اور نہ حکومت ہی باقی رہی جسے عدالتی نظام کے ذریعہ سزائیں نافذ کرنے کا حق تھا۔ پس موجودہ حالت میں ان قوانین کا ذکر کرنا، اور انہیں اسلامی قانون، اسلامی قانون، کہہ کر پکارنا کس قدر بے معنی بات ہے؟ ایسی ہی غلطیاں ہیں جن کی وجہ سے اسلام کی صورت غیروں کی نظروں میں مشتبہ ہوگئی ہے۔ اور اس کی صاف اور روشن تعلیم پر طرح طرح کی بدگمانیوں اور غلط فہمیوں کے پردے پڑ گئے ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اصل سوال کا جواب:

اصل مسئلہ کے متعلق جن لفظوں میں سوال کیا گیا ہے، اُس کا جواب بغیر کسی تامل کے یہ ہے کہ نہ تو اسلام کا یہ قانون ہے اور نہ کوئی ایسا قانون اسلام کا قانون ہو سکتا ہے۔

سوال کے الفاظ یہ ہیں:

''کیا واقعی اسلام کا یہ قانون ہے کہ جو شخص حضرت بانی (داعی) اسلام کے خلاف بدزبانی کرے، اسے فوراً قتل کر ڈالنا چاہیے اور جس مسلمان کے سامنے وہ ایسا کرے، اُس کا مذہبی فرض ہے کہ اُسی وقت اُس کا سر اُڑا دے؟''

جواب یہ ہے کہ قطعاً نہیں، اور تفصیل اس کی اوپر گزر چکی۔

البتہ مسئلہ کی ایک بالکل دوسری قسم کی صورت ہے، اور وہ بلاشبہ فقۂ اسلامی کے قوانین میں موجود ہے۔ وہ صورت یہ تھی کہ اگر ایک ذمی (غیر مسلم باشندہ) اپنے مذہب کے مجنونانہ تعصب کی وجہ سے، یا مسلمانوں کے بغض و عداوت کی وجہ سے، یا حکومت کی تحقیر و تذلیل کے لیے ایسا رویّہ اختیار کر لے کہ پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شان میں سبّ و شتم کرنے لگے یعنی گالیاں بکنے لگے۔ یا اس طرح کی بدزبانی کرنے لگے جو صریحاً سبّ و شتم کا حکم رکھتی ہو، تو اس صورت میں کیا کرنا چاہیے؟ فقہا کی ایک جماعت اس طرف گئی کہ اِس طرزِ عمل کے بعد اُس کا ذمہ و عہد باقی نہیں رہا۔ یعنی اسلامی حکومت نے اُسے جس باہمی سلوک کے معاہدہ پر ہر طرح کے شہری حقوق اور مذہبی آزادی دی تھی، اور اُس کی جان و مال کی حفاظت کی ذمہ دار ہوئی تھی، وہ خود اُسی کے طرف سے شکست ہو گیا، اِس لیے اُسے قتل کرنا چاہیے۔ دوسری جماعت اس طرف گئی ہے کہ اس کی وجہ سے عہد و ذمہ شکست نہیں ہوتا۔ اس لیے قتل کی سزا نہیں دی جا سکتی، البتہ عدالت کو اختیار ہے کہ وہ مصلحت کے مطابق ایسی کارروائی کرے جس سے اس کا سدِ باب ہو جائے۔ پہلی رائے حضرت امام مالکؒ، امام احمدؒ اور امام شافعیؒ کی (کتاب الام میں) ہے۔ دوسری رائے حضرت امام ابوحنیفہؒ کی ہے اور حنابلہ و شافعیہ میں سے بھی ایک جماعت اسی طرف گئی ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جو فقہا اس طرف گئے کہ اس صورت میں قتل کرنا چاہیے، اُنھوں نے جن حالات میں اور جن وجوہ کی بنا پر ایسا حکم تجویز کیا، ضروری ہے کہ ٹھیک طور پر اُسے سمجھ لیا جائے۔ لیکن اُس کی وضاحت اس وقت تک نہیں ہو سکے گی، جس وقت تک یہ بات واضح نہ ہو جائے کہ اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کی حیثیت کیا قرار دی گئی تھی، اور شرعاً ''ذمہ'' اور ''ذمی'' سے مقصود کیا ہے؟ مختصر لفظوں میں اس کی تشریح حسب ذیل ہے:

اسلامی حکومت اور غیر مسلم:

چھٹی صدی مسیحی میں جب اسلام کا ظہور ہوا، تو مذہب و اعتقاد کا اختلاف انسانی قتل و خونریزی کا سب سے بڑا باعث تھا۔ دُنیا کی کوئی قوم ایسی نہ تھی جو حکومت کا اقتدار حاصل کر کے دوسرے مذہب کے پیروؤں کے ساتھ انصاف کر سکتی ہو۔ جس مذہب کے پیرو طاقت و حکومت حاصل کر لیتے تھے، وہ اپنے مذہب کے سوا اور کسی مذہب کی موجودگی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ رومیوں کی قوم اُس عہد کی سب سے بڑی متمدن قوم تسلیم کی گئی ہے، لیکن اُس کا بھی یہ حال تھا کہ جس وقت تک اپنے قدیم مذہب پر قائم رہی، یہودیوں اور عیسائیوں کے لیے اَمن نہ تھا۔ جب مسیحی مذہب قبول کر لیا، تو تمام غیر مسیحی رعایا زندگی اور معیشت کے حقوق سے محروم ہو گئی!

لیکن اسلام نے مذہب اور اعتقاد کی آزادی کا اعلان کیا۔ اُس نے مذہبی رواداری اور انسانی حقوق کی ایک ایسی فضا پیدا کر دی، جس کا اس وقت تک دُنیا میں کوئی نمونہ موجود نہ تھا۔ ۵۰ برس کے بعد جب اسلامی حکومت کا دائرۂ اقتدار وسیع ہوا، تو یہ ایک ایسی مملکت تھی جو اگرچہ خاص ایک مذہب کے پیروؤں کی تھی، لیکن اُس میں حکمران قوم کے دوش بدوش ہر مذہب و ملت کے لوگ آباد تھے، اور سب کو بلا امتیاز ایک ہی طرح کے شہری و ملکی حقوق حاصل تھے۔ مذہب و اعتقاد کے اختلاف کی بنا پر کوئی انسان دوسرے انسان کے انسانی و ملکی حقوق تلف نہیں کر سکتا تھا!

جہاں تک غیر مسلموں کا تعلق ہے، اسلام کا طریق عمل یہ تھا کہ اُس نے فتح مکہ کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بعد عرب کی قدیم بت پرستی کے اعتراف سے تو انکار کر دیا۔ کیونکہ فی الحقیقت اب فعلاً اُس کا کوئی وجود باقی نہیں رہا تھا۔ تمام قبائلِ عرب بہ رضا و رغبت مسلمان ہو گئے تھے۔ لیکن باقی تمام غیر مسلم اقوام کے لیے یہ حکم دیا کہ وہ اسلامی حکومت کے ماتحت اُسی طرح زندگی بسر کر سکتے ہیں، جس طرح خود مسلمان رہتے سہتے ہیں۔ بہ حیثیت شہری ہونے کے اُنھیں وہ تمام حقوق حاصل ہوں گے، جو خود مسلمانوں کو حاصل ہیں۔ مذہبی اصطلاح میں اُنھیں ''ذمی'' کے لفظ سے تعبیر کیا گیا۔ کیونکہ اسلامی حکومت نے ان کی حفاظت جان و مال اور مذہبی آزادی و حقوق کے قیام کا ذمہ لیا تھا۔ اصل اس بارے میں وہ طرزِ عمل ہے جو خود پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) نے غیر مسلموں کے ساتھ وقتاً فوقتاً اختیار کیا تھا، اور ان کے بعد خلفاءِ راشدین اُن پر عامل رہے تھے۔ ایران، شام، اور مصر کی فتح کے بعد وہاں کے غیر مسلم باشندوں کے ساتھ جو معاہدے کیے گئے، وہ آج تک تاریخ و فقہ میں موجود ہیں۔ فقہا نے انھیں سے ذمیوں کے حقوق کے مسائل کا استنباط کیا ہے۔

اسلامی احکام کی رُو سے غیر مسلم باشندوں کے جن حقوق کا بطور عہد و میثاق کے ذمہ لیا گیا تھا، وہ مختصر لفظوں میں حسب ذیل ہیں:

(۱) اُنھیں پوری مذہبی آزادی ملے گی۔ اُن کی مذہبی عبادت گاہیں اور ہر طرح کی مذہبی عمارتیں محفوظ رہیں گی۔ صلیبوں اور مورتیوں کو نقصان نہیں پہونچایا جائے گا۔ وہ سنکھ بجانے سے نہیں روکے جائیں گے۔ وہ اپنے تہواروں میں اپنے جلوس نکال سکیں گے۔ تمام مذہبی عہدے اور انتظامات اُسی طرح قائم رکھے جائیں گے، جس طرح پیشتر سے موجود ہیں۔ لایغیر ما کانوا علیہ۔

(۲) اُنھیں ان کے مذہب سے برگشتہ نہیں کیا جائے گا (بلاذری نے فتوح البلدان میں یہ الفاظ لکھے ہیں: لایفتنوا عن دینھم)

(۳) ان کی جان و مال اور ہر طرح کی جائیداد محفوظ رہے گی۔ اُنہیں اس میں تصرف کے تمام حقوق حاصل ہوں گے۔ اگر اُن کا کوئی دشمن ان پر حملہ کرے گا تو مسلمان ان کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

طرف لڑیں گے۔

(۴) اُن کا کوئی حق چھینا نہیں جائے گا۔

(۵) اُنھیں ان کے مذہبی احکام کے خلاف کسی بات پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔

(۶) قانون کی نظر میں اُن کی جان مسلمانوں کی جان کی طرح ہوگی، اور اُن کا مال مسلمانوں کے مال کی طرح سمجھا جائے گا۔

(۷) تجارت، کاروبار، اور معیشت میں کسی طرح کی روک عائد نہیں کی جائے گی۔ اُن کے ساتھ ویسا ہی سلوک ہوگا، جیسا کہ مسلمانوں کے ساتھ ہوگا۔

(۸) وہ اُن تمام ٹیکسوں سے معاف رکھے جائیں گے جو مسلمانوں کے لیے قرار دیئے گئے ہیں، اُن سے عشر بھی نہیں لیا جائے گا۔

(۹) وہ فوجی خدمت سے بھی معاف رکھے جائیں گے۔

یہ اُن معاہدات کا خلاصہ ہے جو خود پیغمبرِ اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) نے غیر مسلموں سے کیے تھے۔ مثلاً نجران کا معاہدہ جو سنہ ۸ ہجری میں ہوا تھا، اور جس کے پورے الفاظ فتوح البلدان اور کتاب الخراج وغیرہ میں موجود ہیں۔ لیکن خلفاء راشدین کے زمانے میں جب مشرق کے بڑے بڑے متمدن ممالک فتح ہوئے، اور مجوسیوں اور عیسائیوں کی بے شمار آبادیاں اسلام کے ماتحت آ گئیں، تو اِن مجمل شرائط میں اور زیادہ تفصیل ہوئی، اور مذہبی، ملکی، اور معاشرتی آزادئ حقوق کی وہ تمام باتیں پوری صراحت کے ساتھ تسلیم کر لی گئیں، جو آزاد باشندگانِ شہر کے لیے اُس عہد میں ہو سکتی تھیں۔

یہ محض معاہدہ ہی نہیں تھا۔ بلکہ ایک ایسا قطعی اور واضح طرزِ عمل تھا جس مین کسی طرح کے شک وشبہ کی گنجائش نہ تھی۔ مسلمان خلفاء جس درجہ غیر مسلموں کے حقوق کا احساس رکھتے تھے، اُس کا اندازہ صرف اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ حضرت ابوبکر خلیفۂ اوّل سے لے کر حضرت علی (رضی اللہ عنھم) تک، چاروں خلیفوں کے وہ کلماتِ وصیت دیکھ لیے جائیں جو مرتے وقت اُن کی زبان سے جاری ہوئے تھے، اُن میں سب سے پہلے یہ جملہ نظر آئے گا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

''غیر مسلموں کے حقوق کا خیال رکھنا، کیونکہ ہم نے اُن کا ذمہ لیا ہے۔'' ذمیوں کے مذہبی وملکی حقوق کے عام اعتقاد و اعتراف کا یہ حال تھا، کہ فی الحقیقت اُن کی جان مسلمانوں کی جان کی طرح اور اُن کا مال مسلمانوں کے مال کی طرح محفوظ تھا۔ آج اسلام کی نسبت علانیہ کہا جارہا ہے کہ اُس کی نظروں میں ایک غیر مسلم انسان کی زندگی کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ اگر ایک مسلمان ایک غیر مسلم کو اس لیے مار ڈالے کہ وہ بھی مسلمانوں کی طرح اپنا مذہب پھیلانا چاہتا ہے، تو یہ اسلام کی نظروں میں ایک مقدس جہاد ہوگا۔ لیکن کاش ان معترضوں کو معلوم ہوتا کہ یہی اسلام ہے جس نے اپنے عروجِ سلطنت کے زمانے میں، جب دُنیا انسانی جان و مال کے مساویانہ حقوق کا تخیل بھی نہیں کرسکتی تھی، اس قانون کا اعلان کیا تھا کہ ''من کان له دقتنا، فدمُه کدمنا، ودیته کدیتنا'' (☆) ایک غیر مسلم ذمی کا خون بھی ویسا ہی محترم ہے جیسا ہمارا خون، اور اُس کا خوں بہا بھی ویسا ہی ہے جیسا ہمارا۔ یہ صرف زبان ہی کا اعلان نہیں تھا، بلکہ قانون کا دائم و جاری عمل بھی تھا۔ خلفاء راشدین کے زمانے سے لے کر اسلام کی آخری سلطنتوں تک، کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ذمّیوں کا قتل اس لیے جائز رکھا گیا ہو کہ وہ مسلمان نہیں ہیں۔ خلفاءِ راشدین سے بڑھ کر اسلامی تعلیم کے کون پیکر ہو سکتے ہیں؟ لیکن ایک نہیں، بے شمار واقعات موجود ہیں، جن میں حضرت عمر، حضرت عثمان، اور حضرت علی (رضی اللّٰہ عنہم) نے ایسے مسلمانوں کو قتل کرنے کا حکم دیا ہے جنھوں نے کسی عیسائی یا مجوسی باشندے کو قتل کر دیا تھا۔

بہرحال اسلام نے غیر مسلموں کے ساتھ جس رواداری اور انسانی مساوات کا سلوک کیا، اُس کی کوئی مثال نہ تو اس سے پہلے مل سکتی ہے اور نہ اُس کے عہد میں۔ ایک یورپین مورخ (سیدیو) نے اِن لفظوں میں اِس کا اعتراف کیا ہے ''اسلام نے ذمیوں کو بجز ایک حق کے اور تمام حقوق دے دیئے تھے۔ یعنی وہ پادشاہ نہیں ہو سکتے تھے۔''

ان تمام حقوق کے معاوضہ میں اسلامی حکومت اُن سے کیا چاہتی تھی؟ اس پہلو سے

☆ حافظ زیلعی نے ہدایہ کی تخریج میں حضرت علی علیہ السلام کا یہ قول اور ایک فیصلہ نقل کیا ہے جو اُنھوں نے اپنے زمانہ خلافت میں صادر کیا تھا، اور مسلمان قاتل کے قتل کا حکم دیا تھا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بھی معاملہ پر غور کر لینا چاہیے۔ اسلامی حکومت قدرتی طور پر اُن سے اس سلوک کی توقع رکھتی تھی کہ:

وہ حکومت کو اپنی حکومت تصور کریں گے، اور اس کے خلاف کسی بغاوت یا سازش میں حصہ نہیں لیں گے۔

مسلمان ہم وطنوں کے ساتھ شرافت اور رَواداری کا برتاؤ کریں گے۔ جس طرح وہ اُن کے ساتھ بہتر برتاؤ کرتے ہیں۔

وہ کوئی بات ایسی علانیہ نہیں کریں گے، جس سے حکومت کی توہین و تذلیل ہو یا حکومت کے مذہب کی توہین و تذلیل ہو۔

کیا ایک لمحہ کے لیے بھی کوئی شخص ان توقعات کو بے اعتدلانہ قرار دے سکتا ہے؟

چھٹی صدی مسیحی کی دُنیا میں جب اسلام نے ان قوانین کا اعلان کیا تھا، اگر اسلامی حکومت غیر مسلموں کو ہر طرح کے مساویانہ حقوق دے کر اُن سے اس طرزِ عمل کی متوقع رہتی تھی، تو یقیناً یہ کوئی ظالمانہ طرزِ عمل نہ تھا۔ آج دُنیا میں کون قوم اور مذہب ہے جو اپنی تاریخ کے صفحات میں اس طرح کے طرزِ عمل کی ایک مثال بھی دِکھلا سکتا ہے؟

مسئلہ کی نوعیت:

یہ اسلامی حکومتوں کا طرزِ عمل تھا، اور یہ ذمی اور اُن کا ذمہ تھا، جن کی نسبت سوال پیدا ہوا کہ اگر وہ پیغمبرِ اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شان میں علانیہ اور صریح گالیاں بکنے لگیں اور عدالت میں قطعی شہادت و دلائل سے یہ بات ثابت ہو جائے، تو ایسی حالت میں کیا کرنا چاہیے؟ فقہا کی ایک جماعت اس طرف گئی کہ اس پر بھی اُنھیں قتل نہیں کرنا چاہیے۔ کوئی ایسی سزا دے دینی چاہیے جس سے اس شرارت کے بڑھنے اور پھیلنے کا سدباب ہو جائے۔ امام ابوحنیفہ، اور فقہا و شافعیہ و حنبلیہ میں سے ایک جماعت کا یہی مذہب ہے۔ گذشتہ ۶ صدیوں میں جس قدر بڑی بڑی اسلامی حکومتیں قائم ہوئیں، ان کا عمل فقۂ حنفی ہی پر تھا۔ مثلاً ہندوستان کی حکومت مغلیہ اور قسطنطنیہ کی حکومت [illegible] موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے کہ اسی مذہب کے مطابق عمل کیا گیا۔ سلطان مصطفیٰ خاں چہارم کے زمانہ میں ایک ارمنی پر یہ الزام عائد کیا گیا تھا کہ اُس نے مسلمانوں کے ایک مجمع کے سامنے پیغمبرِ اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کا اسمِ گرامی لے کر سب وشتم کیا۔ معاملہ شیخ الاسلام عبداللہ آفندی کے سامنے پیش ہوا، اور اُنھوں نے مقدمہ کی سماعت کے بعد قید کرنے کا حکم دیا۔ سلطان کو جب اس معاملہ کا حال معلوم ہوا تو اس نے شیخ الاسلام سے دریافت کیا ''کیا اس سے زیادہ سخت سزا نہیں دی جا سکتی تھی؟'' شیخ الاسلام نے کہا ''شرعاً میں یہی سزا تجویز کر سکتا ہوں۔ اگر آپ کوئی دوسری سزا دینی چاہتے ہیں تو اپنے حکم سے اسے دیجیے'' سلطان خاموش ہو گیا!

لیکن فقہا کی دوسری جماعت اس طرف گئی کہ اس صورت میں قتل کرنا چاہیے۔ امام مالک، امام احمد، اور امام شافعی سے ایسا ہی منقول ہے۔ اُن کی نظر اس طرف گئی تھی کہ اسلامی حکومت نے ذمیوں کو ہر طرح کے مذہبی، ملکی، اور معاشرتی حقوق دے دیے ہیں، اور باشندۂ ملک ہونے کے اعتبار سے اُن میں اور مسلمانوں میں کوئی امتیاز نہیں کیا ہے۔ اس طرزِ عمل کے بدلے وہ صرف یہ چاہتی ہے کہ جس طرح اُن کے مذہب کا لحاظ رکھا گیا ہے، وہ بھی اسلام کا لحاظ رکھیں، اور کوئی بات علانیہ ایسی نہ کریں جس سے توہین و تذلیل مقصود ہو۔ لیکن اگر اس پر بھی ذمیوں کی ایک جماعت ایسی ہے جو اسلام کا اتنا لحاظ رکھنا بھی گوارا نہیں کرتی کہ اس کے پیغمبر کو خود مسلمانوں کے منہ پر صریح گالیاں نہ دی جائیں، تو ایسی جماعت کسی رعایت کی متمنی نہیں ہے، اُسے قتل کرنا چاہیے۔

خلاصۂ بحث:

یہاں تک جس قدر بیان کیا گیا ہے، اس سے واضح ہو گیا ہو گا کہ:

(۱) فقۂ اسلامی کے جس قانون کا ذکر کیا گیا ہے، وہ اسلام کا کوئی براہِ راست منصوص قانون نہیں ہے، بلکہ تعزیر و سیاست کا ایک فرعی حکم ہے جس میں خود فقہا کی رائیوں میں اختلاف ہوا۔ ایک جماعت نے اُسے تجویز کیا ہے۔ دوسری کو اس سے اختلاف ہے۔ پس یہ فقہا کا بھی کوئی متفقہ فیصلہ نہیں ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(۲) جو جماعت اس رائے کی طرف گئی کہ قتل کرنا چاہیے، اُس نے جن حالات میں یہ بات تجویز کی تھی، اُنھیں پیشِ نظر رکھتے ہوئے کوئی منصف مزاج انسان یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ مذہبی تعصب کا کوئی مجنونانہ حکم تھا۔ یا اس سے مقصود یہ تھا کہ محض غیر مسلم ہونے کی وجہ سے خدا کے بندوں کا خون بہایا جائے۔

(۳) علاوہ بریں یہ بھی ٹھیک نہیں ہے کہ اس قانون کا ذکر کرتے ہوئے ''توہین'' کا لفظ استعمال کیا جائے۔ ''توہین'' کا لفظ بہت زیادہ عام ہے۔ بہت سی باتیں ایسی ہوسکتی ہیں، جن سے ایک شخص کے خیال میں توہین نکلتی ہو۔ دوسرے کے خیال میں نہ نکلتی ہو۔ اس لیے فقہا نے اسے ''سبّ'' کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ ''سبّ'' کے معنی صریح گالی دینے کے ہیں، یا ایسے الفاظ کہنے کے ہیں جو بمنزلۂ دشنام ہوں۔

(۴) پھر جو کچھ بھی ہو، یہ قطعی ہے کہ اس قسم کے قوانین اور اُن کی بحثوں کو موجودہ حالت سے کوئی دُور کی مناسبت بھی نہیں، جیسا کہ مقدمات میں گزر چکا۔

(۵) باقی رہی وہ صورتِ حال جو اس قانون کے تذکرہ کا باعث ہوئی، تو اُس کا حال یہ ہے کہ موجودہ زمانہ قلم اور پریس کی آزادی کا زمانہ ہے۔ بسا اوقات اس آزادی کا استعمال غلط طریقہ پر کیا جاتا ہے، ہندوستان میں سب سے پہلے بعض بدزبان مسیحی مشنریوں نے اسلام و پیغمبرِ اسلام کے خلاف اس قسم کی کتابیں لکھ کر شائع کیں جن کی ایک سطر بھی مہذب اور سنجیدہ نکتہ چینی نہیں کہی جاسکتی۔ اُن کے بعد آریا سماج کے نئے مشنری آئے۔ اُن میں سے بھی بہتوں نے مذہبی تحقیق اور سنجیدہ نکتہ چینی کی جگہ اُنھی کا نقشِ قدم اختیار کیا۔ ''رنگیلا رسول'' نامی رسالہ بھی اِسی قسم کی ایک اخلاقی موت تھی۔ یقیناً حکومت اور قانونِ وقت کا فرض ہے کہ اس قسم کی دلآزار تحریروں کی اشاعت جائز نہ رکھے، اور جائز نکتہ چینی اور مذہبی دلآزاری میں امتیاز کرے، لیکن میں ایک لمحہ کے لیے بھی یہ طریقِ عمل پسند نہیں کرسکتا کہ مسلمان اپنی طبیعت اس انداز کی بنالیں، کہ جہاں کسی ٹٹ پونجئے نے ایک چار ورقی رسالہ چھاپ کر شائع کردیا، ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک تمام مسلمان شور و واویلا شروع کر دیں کہ اسلام کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کشتی غرق ہو گئی اور ''تحفظِ ناموسِ رسول'' کا سوال پیدا ہو گیا۔ نعوذ باللہ! اگر چند جاہل اور کور چشم انسانوں کے بکواس کر دینے سے ''ناموسِ رسولؐ'' کی حفاظت کا سوال پیش آ سکے، یا اسلام اور مسلمانوں کے لیے یہ کوئی مصیبت ہو، ایسا سمجھنا اسلام کی عزت و شرف اور مسلمانوں کی مذہبی خودداری کے اس درجہ خلاف ہے کہ میں سمجھ نہیں سکتا، کیوں کر ایک مسلمان اس کا تصور بھی کر سکتا ہے؟ اس قسم کا ایک رسالہ کیا معنی اگر ایک ہزار یا ایک لاکھ رسالے بھی چھاپ لیے جائیں جب بھی نعوذ باللہ اسلام اور داعیٔ اسلام کے ناموس کے تحفظ کا کوئی سوال پیدا نہیں ہو سکتا۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ جس طرح ہمیشہ بری زبان اور برے اخلاق کے لوگ موجود رہے ہیں، اب بھی موجود ہیں۔ اگر اُن کی تحریروں میں کوئی ایک سطر بھی ایسی موجود ہے جس میں کوئی سنجیدہ اعتراض کیا گیا ہے، تو چاہیے کہ اُس کا جواب دے دیا جائے۔ باقی جس قدر بدزبانی ہے، وہ بحکم ''کالائے بد بریش خاوند'' اُنہی کے لیے چھوڑ دینی چاہیے۔

© rasailojaraid.com